سلسلۂ مطبوعات رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز — ۱۰

نثر کا حسن

میرے عہد کے صاحبِ طرز نثر نگار

رشید احمد صدیقی
ڈاکٹر ذاکر حسین
ابو الکلام آزاد
خواجہ غلام السیدین
محمد مجیب
وصی احمد بلگرامی
نیاز فتحپوری
رگھوپت سہائے فراق
آل احمد سرور
یگانہ (علیگ)
مشتاق احمد یوسفی
سید عابد حسین

از

عابد رضا بیدار

رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز

۱۸۰۶، کلاں محل، دہلی ۶

نثر کا حُسن

میرے عہد کے صاحبِ طرز نثر نگار

عابد رضا بیدار

رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز

جمال پرنٹنگ پریس، دہلی
قیمت دس روپے
تعداد حسب معمول (دو سو)
ستمبر ۱۹۶۸ء

جیلانی صاحب (سید حامد حسین جیلانی) کی نذر

پیش گفتار

ابھی اِس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

یہ شعر بعض سے دوسرے مناسب موقعوں کی طرح ان لکھنے والوں کے لیے بھی کہا گیا ہے جو محض اپنی جنبشِ لب سے پہچان لیے جاتے ہیں۔ شاعری کی طرح اردو نثر میں بھی کچھ ایسے طرحدار لکھنے والے موجود ہیں جو اپنے منفرد طرزِ گفتگو سے صاف سمجھ میں آجاتے ہیں۔

قدما میں یہ پہچان اتنی نمایاں طور سے واضح نہ ہوتے ہوئے بھی ناپید یقیناً نہیں ہے۔ میر امن، اور رجب علی بیگ سرور، پھر غالب، پھر سرشار، محمد حسین آزاد، شبلی، پھر بعد میں مہدی افادی، میر ناصر علی اور سجاد انصاری اور اب تازہ رنگ میں قاضی عبدالغفار، حسن نظامی، نیاز، وصی بلگرامی اور ابو الکلام، اردو کے طرحدار ادیبوں میں یہ معروف نام ہیں۔ یوں شبلی اور آزاد کے عہد میں ان سے بڑے اور اچھے لکھنے والے موجود رہے ہیں لیکن وہ اس زمرے میں نہیں سماتے۔ رشید صاحب کے بقول وہ بنیادی نثر لکھنے والے ادیب ہیں۔ یہ بنیادی نثر اور طرحدار نثر کا فرق آپ کو اگلی اور پچھلی اور موجودہ سب تحریروں کے لیے کرنا پڑے گا۔ سرسید اور حالی مثلاً شبلی کے عہد میں، پریم چند اور عبدالحق ان کے بعد، اور عابد حسین موجودہ عہد میں ــــ بنیادی نثر لکھنے والے علامتی ناموں کے طور سے آپ پیشِ نظر رکھ سکتے ہیں موجودہ لکھنے والوں میں ابوالحسن علی ندوی اور ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں میں فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ کسی حد تک ان کی آواز پہچان میں بھی آجاتی ہے خصوصاً آخر الذکر کی۔ لیکن میرا ایسا خیال ہے کہ یہ دونوں اسلوب کے بجائے اپنے

موضوع اور اس میں طرزِ استدلال سے زیادہ پہچان میں آتے ہیں بہ نسبت محض اپنی آواز کے! کچھ ایسی ہی بات محمد عثمان فارقلیط کی بھی ہے۔ اسی طرح قاضی عبدالودود کے بارے میں بھی بعضوں کا گمان ہے کہ وہ پہچان میں آجاتے ہیں اس لئے اس گروپ میں آسکتے ہیں۔ لیکن ان کے سلسلہ میں میرا خیال یہ ہے کہ ان کی پہچان اس لئے واضح ہوگئی ہے کہ وہ انتہائی بنیادی نثر لکھنے والے ہیں۔ اس لئے انہیں بنیادی نثر نگاروں کے زمرے میں رکھنا مناسب ہوگا۔

پچھلوں میں میرامن کا جہاں تک تعلق ہے وہ اپنے سے زیادہ فورٹ ولیم کالج کی شخصیت کی نمائندگی کرتے ہیں، یوں بھی انکا مقام بنیادی نثر نگاروں میں زیادہ صحیح ہے۔ رجب علی بیگ سرور اور سرشار کے بارے میں یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا طرزِ نگارش ان کی ذاتی شخصیت کی نمائندگی کرتا ہے یا محض اس مکتبِ نثر کی جو رائج تھا۔ سرشار میں تو یوں بھی سرور جیسی پہچان بھی نہیں ہے اور خود سرور کا طرز وہی داستانوں والا طرز ہے، جس میں کہنا چاہیے انہوں نے کس قدر ریاضت کر لی ہے۔ محمد حسین آزاد کا رنگ الگ ہے۔ لیکن کیا وہ انکا اپنا رنگ، انکی اپنی اختراع، ان کی شخصیت کا اظہار سمجھا جا سکتا ہے، اس میں مجھے شک ہے، تاریخ اسے بھی محض رنگین نثر یا عبارت آرائی کے ایک اہم ابتدائی نمونے کی حیثیت سے یاد رکھ سکتی ہے۔ شبلی کی شگفتہ نثر کی کچھ اپنی خصوصیات ضرور ہیں لیکن ہمیشہ وہ پہچان میں بھی آجائیں یہ ضروری نہیں۔ مہدی، سجاد انصاری میر ناصر علی ـــــ اور اس طرح حسن نظامی بھی ایک اہم مسئلہ ہیں۔ مہدی سے بات شروع کی جائے تو شاید آسانی سے سلجھتی جائے۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ اردو کے مشرقی ماحول میں انگریزی داں طبقہ کی یہ پہلی دراندازی تھی اور بس۔ اس کے علاوہ اگر کچھ ہے تو اس میں آمد سے زیادہ آورد ہے اور بناوٹ اندرونی شخصیت کا اظہار کبھی نہیں ہوا کرتی۔ سجاد انصاری بھی کہیں کہیں اپنی شخصیت کی چھاپ بے طرح چھوڑ جاتے ہیں۔ لیکن بغور مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ جو ان کی اصل دلآویزی ہے وہ مغرب کا اجالا ہے! کہیں آسکر وائلڈ کہیں کوئی اور۔ اور صرف اس میں کوئی حرج بھی نہ تھا اگر یہ رنگ انکی ساری

تحریروں میں جاری وساری ہو جاتا۔ جو نہیں ہو سکا۔ حسن نظامی اور ان سے پہلے میر ناصر علی کے سلسلہ میں بھی مجھے یہی بات دہرانی پڑے گی۔ ان کی تحریروں میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ، جنیں خیاں والی بات، اور اس بات کا احساس کہ ان کی تحریر کسی نمائش گاہ میں جارہی ہو۔ یہ سب کچھ ایسا انداز پیدا کر دیتے ہیں کہ اس میں فطری حسن کم ہوتا جاتا ہے (یہ بات بیک وقت میر ناصر علی کی رنگین نوائی اور حسن نظامی کی سادہ نگاری پر لاگو ہوتی ہے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے عمر بھر اپنی شخصیت کو ایک خول پہنائے رکھا تھا۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ان کی الگ الگ موضوعات پر لکھی ہوئی تحریروں کا انداز الگ الگ ہے، بالکل ایک حجاب پہنیں۔ اور اس ذیل میں لیلیٰ کے خطوط والے منفرد ادیب قاضی عبدالغفار بھی آجاتے ہیں جن کی دوسری تحریروں میں یہ شدتِ احساس بالکل بھی نہیں خود لیلیٰ کے خطوط میں بھی شاید اسلوب سے زیادہ نیا طرزِ فکر ہے جو متاثر کرتا ہے۔

کبھی کبھی تو میرے ذہن میں غالب کے سلسلہ میں بھی یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس کے اردوئے معلیٰ اور عودِ ہندی والے خطوط اور وہ خطوط جو رام پور کے حکمرانوں کے نام لکھے گئے، ان میں واضح فرق کیوں ہے۔ کہیں یہ بات تو نہیں کہ شاعری غالب کی شخصیت کا اصل اظہار وسیلہ بن سکتی نثر نہیں!

میرے ہم عصروں میں ان لوگوں میں جو آزادی کے بعد زندہ رہے یا زندہ ہیں، ایسے نثر نگار کہ،

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے،

جو ایک دو جملے لکھیں تو پہچان لیے جائیں پچیس کے قریب ضرور ہیں پہلی قسط کے طور پر میں نے دس بارہ ایسے لکھنے والوں کو یہاں ان کی بعض دلچسپ اور اہم تحریروں کے انتخاب کی صورت میں پیش کیا ہے

آٹھ

اگلے حصے میں عبدالماجد دریا بادی، مجنوں، حجاب امتیاز علی، قرۃ العین حیدر، صحافی عبدالباقی، خورشید الاسلام، خواجہ محمد شفیع عامر عثمانی اور چند اور لوگ شامل ہوں گے۔

عابد رضا بیدار

رشید احمد صدیقی

رشید احمد صدیقی

موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال

اقبالؔ کو معلوم نہیں کس عالم میں آب رود گنگا اور گلستانِ اندلس کی یاد آئی۔ اس وقت ذاکر صاحب کے تصور کے ساتھ مجھے علی گڑھ یاد آرہا ہے اور کیوں نہ آئے جب بلاکشانِ علی گڑھ کے لیے آب رود گنگا اور گلستان اندلس دونوں کا قران السعدین علی گڑھ ہو۔

گلستان اور رودبار دونوں کی زندگی و زیبائی کا مدار ایک دوسرے پر ہے۔ زندگی آزادی اور روانی ہے۔ اسی آزادی اور روانی سے زندہ ہیں اقوام"۔ اور انکی اقوام کے جلیل و جمیل کارنامے گلستان اندلس ہیں جن کو وہ آب رود گنگا (زندہ رود) کے کنارے اور سہارے تعمیر کرتی چلی جاتی ہیں۔ آب رود گنگا ایک صلائے عزم و عزیمت ہے ازلی و ابدی صحت مند حوصلہ مندی اور پیہم جوئی کی۔ جو ملتیں اس رمز کو نہیں سمجھتیں یا اس آزمائش میں پڑنے سے گریز کرتی ہیں وہ اپنی تقدیر کو صرف جھیلتی ہیں، اس کو بدل نہیں سکتیں۔

۱۹۱۵ء میں ایم اے او کالج میں داخلہ لیا اور ذاکر صاحب سے پہلے پہل ملاقات ہوئی۔ موصوف دو ایک سال پہلے سے یہاں طالب علم تھے۔ جون پورسے آیا تھا جو کبھی علم و فضل اور شرافت و شائستگی کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ ذوق اور ذہن پر اس کا برائے نام تصرف بھی تھا۔

علی گڑھ نے اس تصرف کو تازہ اور توانا کر دیا اور ایسا محسوس ہوا جیسے امید و آرزو کا ایک وسیع روشن افق سامنے آ گیا ہو اور نئی راہیں اور وادیاں نئے سفر اور نئے برگ و سامان اور نئی تقدیر کی دعوت اور بشارت دے رہی ہوں۔ جن سے ملا جن کو دیکھا یا اس ادارے کی جن گرانمایہ اور دلآویز شخصیتوں کے بارے میں سنا اس سے اس آب رود گنگا اور گلستان اندلس کا نقشہ سامنے آیا جن کی چالیس سال پہلے علی گڑھ میں داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ اس نقشے نے اپنے سے پہلے کی گنگا اور اندلس کی نشاندہی کی۔ یہاں تک کہ تصور و تاریخ کے بیشمار اوراق مصور دیکھتا ہوا اس دیار شرف و سعادت تک پہنچ گیا جہاں سے عظمت انسان و انسانیت کے ہر رود گنگا اور گلستان اندلس کی آبیاری ہوتی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ذاکر صاحب کے دو بڑے بھائی مظفر حسین خاں اور عابد حسین خاں مرحومین یہاں کے طالب علم رہ چکے تھے۔ ان میں سے کسی کو میں نے نہیں دیکھا لیکن ان کی شرافت اور ذہانت کا چرچا ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر تھا۔ اس کی تصدیق ذاکر صاحب کی پاکیزہ سیرت غیر معمولی قابلیت اور دلکش شخصیت سے اس طرح ہوتی تھی جیسے ان بھائیوں میں سے کسی سے براہ راست متعارف ہونے کی ضرورت نہ رہ جاتی ہو۔ جن لوگوں نے عابد حسین خاں مرحوم کو دیکھا تھا ان کا بیان ہے کہ ذہانت و فطانت میں وہ تمام بھائیوں میں فرد تھے۔ مظفر حسین خاں مرحوم کے بارے میں مشہور تھا کہ بڑے سنجیدہ، ذی علم، صلح جو، کم سخن اور عزلت پسند تھے۔ ان کا ایک انگریزی مضمون اس وقت کے ایک بڑے ممتاز انگریزی رسالہ "ماڈرن ریویو" میں پڑھا تھا جس کے ساتھ ان کی تصویر بھی چھپی تھی مضمون ایسی سہل اور شستہ زبان میں لکھا گیا تھا کہ اس کے سمجھنے میں نہ صرف یہ کہ کوئی دقت نہیں ہوئی بلکہ ایسا محسوس ہوا جیسے سہل اردو اور یہ انگریزی ایک ہوں چوتھے بھائی زاہد حسین خاں تھے جو میرے سامنے فرسٹ ایر میں داخل ہوئے۔ کتنا قد آور، متناسب الاعضا، سرخ سپید، خوش رُو، شرمیلا، پاکباز نوجوان، مشکل سے سولہ سترہ سال کا سن۔ اقبال نے ایسے نوجوان کو قبیلے کی آنکھ کا تارا کہا ہوگا۔ ان کو دیکھ کر کچھ اس طرح کا احساس ہونے لگتا جیسے یہ قائم گنج سے نہ آئے ہوں بلکہ جنت سے براہ راست

علی گڑھ میں اُتار دیے گئے ہوں۔ ایک دن معلوم ہوا کہ وہیں پہنچ گئے جہاں سے ان کے اتارے جانے کا خیال دل میں پیدا ہوا کرتا تھا۔ خاندانی نامراد مرض دق کا تینوں بھائی شکار ہوئے دوسرے دو بھائی یوسف حسین خاں اور محمود حسین خاں ہیں۔

پچھلے سال یوسف صاحب مسلم یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلر شپ سے سبکدوش ہو کر رخصت ہو رہے تھے۔ سارا اسباب بھیجا جا چکا تھا۔ جانے میں دو تین دن رہ گئے تھے۔ ایک آدھ میز دو چار کرسیاں ادھر ادھر پڑی تھیں۔ بیگم یوسف کی طویل علالت اندیشہ ناک حد تک پہنچ چکی تھی۔ یونیورسٹی کی فضا ویران اور سنسان جیسے معلوم نہیں کب کس کو کیا سانحہ پیش آجائے۔ جنگ کی ہولناکیوں سے ملک دوچار۔ حسب معمول ملنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ضخیم کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہیں۔ قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں اک "جذبہ بے اختیار شوق" سے فرمایا آپ نے سر سید کی تفسیر کلام پاک پڑھی ہے کل ہی لائبریری سے لایا، کبھی پہلے نظر سے گذری تھی اب جو دیکھتا ہوں تو عجب اک جہان معنی ہے میں نے دبی زبان عرض کیا سر سید کی تفسیر تو نہیں ان دنوں ان کی اسباب بغاوت ہند کی بحث کیا کرتا ہوں۔ جن تشویشناک حالات کے نرغے میں یوسف صاحب اس وقت تھے اس میں ان کے مطالعے کا یہ انہماک دیکھ کر حیران رہ گیا۔ تاریخ تنقید فلسفہ مذہب ادب بالخصوص فرانسیسی ادب کا اتنا جامع اور مستند مطالعہ آس پاس کے لوگوں میں سے کسی اور کے حصے میں شاید ہی آیا ہو۔ یونیورسٹی کے ہمہ وقت انتظامی امور کے فشار میں مبتلا غیر معمولی ناسازگار حالات میں گرفتار لیکن علم و ادب سے یہ شغف یوسف صاحب کی سیرت کے بعض بڑے صالح اور دلکش پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے، جیسے اعلیٰ اقدار کی پیروی سے انھوں نے اپنے آپ کو زندگی اور زمانے کے مکائد و مصائب سے بے نیاز کر لیا ہو۔

اس وقت ۱۹۴۷ء کا بہیمانہ دور خون آشامی و غارتگری یاد آتا ہے مسلسل تردد و تشویش اور جانکاہی کے سبب ذاکر صاحب کی صحت تیزی سے گرنے لگی تھی۔ احباب اور ڈاکٹروں کے

اصرار سے مجبور ہو کر بحالیِ صحت کی خاطر کشمیر کے لیے روانہ ہوئے۔ جالندھر پر ٹرین روک لی گئی جہاں خونریزی کا جنون انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ ذاکر صاحب کو گاڑی سے اتار کر قتل گاہ کی طرف لے چلے۔ اللہ کی رحمت سے جس کا گوارا نام ہم نے بخت و اتفاق رکھا ہے، ریلوے کا ایک اہلکار ذاکر صاحب کو پہچان لیتا ہے اور انھیں اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں بٹھا کر ایک سکھ فوجی افسر کو بلا لاتا ہے۔ یہ افسر عین اس وقت جب تلواریں چھرے اور غضبناک نعرے فضا میں بلند ہو رہے تھے، ذاکر صاحب کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے۔ یہ دونوں ہمیشہ ہماری احسانمندی اور شکر گذاری کے سائے میں رہیں گے۔

یہ حادثہ دیکھا نہیں لیکن اس کا تصور کر سکتا ہوں۔ ذاکر صاحب سوئے مقتل اس دلجمعی سے جا رہے ہوں گے جیسے جمہوریہ ہند کے صدر کی حیثیت سے کسی علمی ثقافتی یا اس طرح کی کسی تقریب کا افتتاح کرنے یا پھر کسی شادی خانہ آبادی میں بانیانِ تقریب دولھا دلھن کے ساتھ تصویر کھنچوانے ان کو ہاتھوں ہاتھ اور زیادہ ہوا تو کشاں کشاں لیے جا رہے ہوں۔ بہرحال بخیریت تمام دہلی مکان پر واپس آئے تو بشرے سے ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی میلاد خواں مہنگے سمے توقع سے زیادہ نقدی اور مٹھائی پاکر بیوی بچوں میں پہنچ گیا ہو۔

ذاکر صاحب کے اس اطمینان و استقامت کے ذکر کے ساتھ ایک اور حادثہ یاد آتا ہے جو آنکھوں کے سامنے گذرا جب وہ یہاں وائس چانسلر کی حیثیت سے تشریف لائے۔ ان پر قلب کا دورہ پڑا اور وہ سب گذر گیا جو ایسے میں گذرا کرتا ہے۔ اس کا ذکر نہ کرتا اگر کچھ دنوں بعد خود اس حادثے سے دوچار نہ ہوا ہوتا اور یہ نہ معلوم ہوتا کہ اس کے شدائد کیا ہوتے ہیں اور ایسے میں نفس کی کمتری یا روح کی برتری کب کہاں اور کس طرح اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ ہم دونوں شام کو تھوڑی دور ٹہل کر واپس آئے تھے۔ ذاکر صاحب مہمان کے کمرے میں بیٹھ گئے میں اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس گیا تو کوئی غیر معمولی بات نہ دیکھی سوا اس کے کہ موصوف شیروانی سمیت چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ دن میں وہ شیروانی شاید ہی اُتارتے ہوں۔

آرام کرنا ہوا تو اچکن سمیت لیٹ رہیں گے اور جا ندک اشارہ یا اطلاع اس طرح اٹھ کھڑے ہوں گے جیسے امرجنسی وارڈ کے ڈاکٹروں کے آرام کرنے اور اٹھ کھڑے ہونے کا طریقہ ہے۔ چاہا کہ ادھر ادھر کی کوئی بات چھیڑوں۔ ذاکر صاحب نے بڑے ہموار اور استوار لہجے میں فرمایا قلب کا دورہ پڑ رہا ہے، ایسا محسوس ہوا جیسے آخری وقت ہے، چاہا کہ آپ کو آواز دوں پھر خیال آیا کہ جلدی کیا ہے، جو ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا، آپ بھی آتے ہی ہوں گے۔ ذاکر صاحب کے اس اطمینان قلب پر دم بخود رہ گیا۔ موصوف نے بالکل نہیں کہا کہ ڈاکٹر بلایا جائے گھر پر اطلاع کی جائے یا وہاں پہنچا دیا جائے۔ ڈاکٹر بلائے گئے گھر پر اطلاع کی گئی موٹر آئی اور بڑے اطمینان سے اس میں بیٹھ کر کوٹھی پر آ گئے۔ جیسے کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ ذاکر صاحب پر وہ سب حادثے گذر گئے سوا زندگی کے آخری حادثے کے۔ میرا ہر وقت کا آنا جانا رہتا تھا۔ ذاکر صاحب پر جا ہے جو گذری ہو لیکن بات چیت یا چہرے بشرے سے کبھی یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ ہر لمحہ کتنے سنگین امکانات کی زد میں تھے۔ ہمیشہ اسی لطف و شگفتہ روئی سے گفتگو کی جیسے پہلے کیا کرتے تھے۔ جالندھر میں قاتلوں اور ان کی ننگی تلواروں اور چھروں کا سامنا اور کس درجہ غیر طبعی المناک موت سے صرف چند لمحوں کا فاصلہ رہ گیا تھا دوسری طرف علی گڑھ میں قلب کا شدید دورہ پڑا اور یہ طبعی موت بالعموم جیسی غیر طبعی ہوتی ہے کسے نہیں معلوم لیکن دونوں آزمائشیں وہ اس طرح جھیل گئے جیسے "اک موتِ خون وہ بھی"۔

ان بھائیوں میں شرافت حمیت اور استقامت کے جوہر ان کی نسلی اور قبائلی صفات میں سے ہیں دوسری طرف علم سے شغف اور اس کو اعلیٰ سطح تک پہنچانے کی مشکل و مبارک مہم کی سربراہی اور اس میں کامیابی بجائے خود ان کا بڑا قیمتی کارنامہ ہے۔ محمود صاحب نے جرمنی سے اور یوسف صاحب نے فرانس سے ڈاکٹریٹ لی اور پروفیسری پر فائز رہے۔ محمود صاحب حکومت پاکستان میں وزیر تعلیم اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ اب کراچی یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ہیں۔ یوسف صاحب جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر تھے اور کئی سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر شپ کے فرائض انجام دیے۔ ذاکر صاحب کے بارے میں کون کیا نہیں جانتا۔ تفصیل اس کی یہ ہے

میں مل جائے گی۔

سوچتا ہوں اگر تینوں مرحوم بھائی زندہ رہتے اور ترقی کے جیسے آثار ان میں ہویدا تھے ان کو برگ و بار لانے کا موقع ملا ہوتا تو آج ان کی موجودگی اور بے بہا خدمات سے ہمارے وزن و وقعت میں کتنا گرانقدر اضافہ ہوتا۔ زندگی کی شام میں ماضی کی یادوں کا کارواں ایک بار متحرک ہو جائے تو اس کو قابو میں لانا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسا کرنا شاید گوارا بھی نہیں ہوتا۔ خیال ہوتا ہے کہ ان تمام بھائیوں کے بے بہا کارناموں کو دیکھنے کے لیے ان کے والدین جنھوں نے اوسط سے بھی کم عمر پائی بقید حیات ہوتے تو اقبال کی زبان سے یہ کہنے میں کتنے حق بجانب ہوتے:

میرے گوہر تمام یک دانہ

ذاکر صاحب ایم اے او کالج میں بحیثیت طالب علم داخل ہوئے تو پہلی جنگ عظیم برپا تھی۔ ہندستان میں ایک نیا سیاسی اور تہذیبی شعور بیدار ہو چکا تھا۔ یہ نتیجہ تھا دادا بھائی نوروجی، سرسید، گوکھلے، تلک اور ان کے دوسرے جلیل القدر ہمعصروں کی بیمثل ذہنی و سیاسی قیادت کا جس کے طفیل ملک میں اعلیٰ صلاحیتوں کی حامل ایک نئی نسل وجود میں آ چکی تھی اور عام ذہنوں میں قومی مقاصد و عزائم کا ایک دلکش اور واضح تصور جھلکنے لگا تھا۔ اس نئے ذہن اور جذبے کی ترجمانی اور قیادت گاندھی جی، محمد علی، ابوالکلام آزاد، موتی لال نہرو، مختار احمد انصاری، سی آر داس، ٹیگور، اقبال، سروجنی نائیڈو اور جواہر لال نہرو کر رہے تھے۔ ان کے اخلاص اعتماد اور اولوالعزمی سے ہندستان میں ایک ہمہ گیر ذہنی سیاسی تحریک کا آغاز ہوا جو بدیسی حکومت کو ہر قدم پہ چیلنج کر رہی تھی۔ اس کا نہایت مؤثر اور قابل قدر اظہار حکومت کے خلاف اُس سیاسی ہندو مسلم اتحاد کی شکل میں ہوا جسے عام طور پہ خلافت اور نان کوآپریشن کی تحریک سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلو تھے جن کی تفصیل کی یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت۔ مجموعی حیثیت سے اس تحریک نے قومی آزادی کے بنیادی مقاصد کے حصول میں تاریخی خدمت انجام دی اور بدیسی حکومت کی گلوافشار گرفت کو ڈھیلا کیا۔ اس کے علاوہ

مغربی ادب اور علوم و فنون سے پچھلی صدی میں ہندی ذہن کا جو تعلق قائم ہوا تھا اور پہلی
جنگِ عظیم سے جو نئی صورت پیدا ہوئی تھی وہ اب ایک ایسی فکر ایک ایسے جذبے اور ایک
ایسی بصیرت کی شکل میں نمودار ہو رہی تھی جس کو بحیثیت مجموعی قومی تہذیب و تمدن کی اہم
اور معنی خیز بازیافت اور عالمی سیاسی و ذہنی رجحانات کے ایک نئے نامیاتی اور ناگزیر
شعور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت کی سیاسی تصویر کو سامنے رکھیں تو کم و بیش تین واضح نقطۂ نظر کار فرما نظر آتے
ہیں۔ ایک نقطۂ نظر انتہا پسندی کا تھا۔ اس کے کارکن یوں تو سارے ہندستان میں تھے لیکن
ان کا دائرہ محدود تھا۔ ان کی موجودگی کا احساس بدیسی حکومت کے لیے بڑے تردّد کا باعث تھا۔
گاہے گاہے ان کی شدید اور سنگین کارروائیاں ملک کی سیاسی فضا کو جھنجھوڑ دیا کرتی تھیں۔ اس
کے جواب میں حکومت سخت اقدامات کرتی تو اس کا ردِ عمل مزید عام سیاسی بیداری کی صورت میں
ہوتا۔ لیکن مجموعی طور پر ہندستانی ذہن نے انارکسٹ تحریک کے طریقۂ کار کو اپنانے سے احتراز
کیا۔ اس طور پر سیاسی جدوجہد کو یکسر خفیہ اور سازشی انداز اختیار کرنے سے محفوظ رکھا۔ دوسرا
نقطۂ نظر حکومت سے مفاہمت کر کے مراعات اور حقوق حاصل کرنے کا تھا۔ اس کے ماننے والوں
میں ہر مذہب اور علاقے کے امیر امرا نوکری پیشہ اور زمیندار قسم کے لوگ تھے جو اپنے چھوٹے بڑے
مفاد کی خاطر حکومت کا تقرب اور تائید حاصل کرنے کے درپے رہتے۔ ان کی تمام تر کوشش کا مقصد و
ماحصل یہ ہوتا کہ ملک کے سماجی اور سیاسی نظام میں کوئی ایسی بڑی تبدیلی نہ ہونے پائے جو ان کے
مفاد اور مستقبل کو خطرے میں ڈال دے۔ اس لیے وہ ایک طرف حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے
کی مستقل کوشش و کاوش میں مبتلا رہتے اور دوسری طرف اپنی فطری اور اکتسابی موقع شناسی کو
کام میں لا کر اپنے گروہ یا صوبے کی رائے عامہ کو متاثر کرنے کے لیے وقت کے مناسبِ حال مسائل
پیش کرتے اور ایک حد تک ان کو حل کرا کے اپنی سیادت کو متعین کرا لیے رہتے۔ اکثر یہ سب حکومت
کے ایما سے ہوتا لیکن اس چابک دستی اور خوبصورتی سے کہ اچھے بھلے لوگ اس سے متاثر ہوتے اور ان کی
تائید کرتے۔ تیسرا نقطۂ نظر زیادہ واضح مثبت اور قابلِ قدر انداز کا تھا۔ اس کے حامی ملک کی نجات،

آزادی جمہوریت اور مساوات میں تلاش کرتے تھے اور ایک با اصول تنظیم اور ہمہ گیر قومی سیاسی و ذہنی تحریک کا فروغ اور ایک پسماندہ معیشت اور معاشرے کو باقاعدہ طور پر کم از کم وقت میں ترقی کے اعلیٰ مدارج سے ہمکنار کرنا چاہتے تھے۔

اس زمانے کا تفصیلی جائزہ لینا تاریخ سیاسیات سماجیات اور معاشیات کے ماہرین کا کام ہے۔ میرا مقصد تو اس وقت کی مخصوص فضا اور نقشے کے بعض ایسے پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا ہے جن سے اس وقت کے نوجوان خاص طور سے متاثر تھے۔ صورت حال خاصی پیچیدہ تھی اور فکر و عمل میں کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنا آسان نہ تھا۔ اس لیے کہ بنیادی طور پر ہندستانی ذہن کی تعمیر و ساخت مختلف النوع احساسات تصورات اور روایات سے ہوئی تھی جو بیک وقت اتنے بڑے ملک اور اس کی اتنے مختلف قماش و قرینے کی آبادی کے باہمی اختلاف و ارتباط کی ترجمان تھی۔ چنانچہ ہندستان کی بڑی شخصیتوں کو اکثر یہاں کے اجتماعی قومی ورثے اور تاریخ کی ایسی تعریف و تعبیر پیش کرنے میں دشواری پیش آتی ہے جو ملک میں مختلف رہنے بسنے والوں کے لیے یکساں طور پر قابل قبول ہو اس لیے کہ مختلف عقائد، مختلف زبانوں اور مختلف رسم و رواج کی موجودگی میں مشترک اقدار کے احساس کو اس طور پر ذہنوں میں جاگزیں کرنا کہ وہ قومی مزاج و موقف بن جائے آسان نہیں ہے۔ چنانچہ ہمارے اچھے سے اچھے آدمی کی نیت پر خود اس کے لوگوں نے شبہہ کیا اور اس کے قول و فعل کو مخصوص مفادات کی پاسداری پر محمول کیا۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ مشترک تہذیب اور بہم ملنے کی توضیح و توسیع کے مبارک اور مہتم بالشان کام کرنے کے لیے جتنے بامقصد مشاہدے، جتنے گہرے مطالعے، جس وسیع ہمدردی، بے لوث عمل، گہری ریاضت اور محکم دوستداری کی ضرورت تھی وہ ایک عرصے سے قوم کی سیاسی اور تہذیبی زندگی میں عام طور سے موجود نہ تھی۔

یہ اس صورت حال کا اجمالی نقشہ ہے جس سے ذاکر صاحب کا، بحیثیت ایک ذہین مخلص اور حوصلہ مند نوجوان طالب علم کے سابقہ ہوا۔ کالج میں ذاکر صاحب کا شمار اس وقت کے مثالی طلبا میں تھا۔ ساتھی طلبہ بڑی عزت و محبت کرتے تھے اور اساتذہ ان کی غیر معمولی ذہانت قابلیت اور سیرت کا

خاص طور پر لحاظ رکھتے تھے، باوجود اس کے کہ اس زمانے کا یوروپین اسٹاف ذاکر صاحب کے نمونے کے طلبا سے کچھ زیادہ خوش گمان نہیں رہتا تھا۔ سبب یہ تھا کہ صورت حال کیسی ہی ہو ذاکر صاحب حفظِ مراتب کے آداب اور تقاضوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ خدا نے ان کو جن صفات سے نوازا تھا خود کو اس کا اہل اور شکر گذار ثابت کرنے کے لیے انھوں نے جس مجاہدۂ نفس، احتساب عمل اور احساسِ ذمہ داری کو تمام عمر اپنی زندگی کا شعار بنائے رکھا، ان کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ آدمی کی بڑائی اس سے بھی پہچانی جاتی ہے کہ قدرت کی دی ہوئی نعمتوں کو وہ کس طرح اور کس مقصد کے لیے کام میں لاتا ہے، اپنی نمود و بہبود کا وسیلہ بناتا ہے یا ان کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے وقف رکھتا ہے جس سے ضرورتمند زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ ذاکر صاحب ہمیشہ موخرالذکر طبقے میں نہایت ممتاز درجے پر پائے گئے۔ شباب کے نشہ و نشاط کو خدمت خلق کے صوم وصلوٰۃ پر نثار کر دینا آسان نہیں۔

ذاکر صاحب اس ادارے کے طالب علم رہ چکے ہیں جو نہ صرف ایک مستند مقبول اور اس وقت سے اب تک ایک عدیم المثال اعلیٰ ماڈرن تعلیمی ادارے کی حیثیت رکھتا ہے، بلکہ ہندستانی تہذیب کے ایک مخصوص اور مبارک پہلو کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ علی گڑھ مسلمانوں کے تعلیمی و تہذیبی مقاصد کا مرکز اور سرچشمہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے وسیلے سے ملک کی ناموری اور خوشحالی میں ساجھی رہنے بسنے والوں سے توافق و تعاون کا متمنی بھی رہتا ہے اور مبلغ بھی۔ حسب حال و ضرورت جدید تعلیم دینے اور پھیلانے کا حامی سرسید سے زیادہ ان کے عہد میں شاید ہی کوئی اور رہا ہو۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ملک کی حقیقی اور ہمہ جہتی ترقی و ترفیع کے پروگرام میں تعداد اور طاقت کو اتنی اہمیت نہیں دی جتنی حقیقی اور عام تعلیم و تربیت کو۔ اور سرسید کا تعلیم کا یہ تصور اعلیٰ اور دُور رس امکانات کے اعتبار سے کتنا صحیح تھا۔

اس طور پر زمانۂ طالب علمی ہی میں ذاکر صاحب کو مسلمانوں کی ذہنی، اخلاقی اور سیاسی زندگی کے جملہ نشیب و فراز، اہم شخصیتوں، اور مکاتب فکر سے براہِ راست آشنا ہونے کا موقع ملا۔ اس کے

علاوہ وہ مشترک و مستحسن خاندانی روایات تھیں جو یہاں کے طلبا اپنے اپنے گھروں سے لاتے تھے، اسلاف کے وہ کارنامے تھے جو انھوں نے بزرگوں میں دیکھے، ان سے سُنے، اور کتابوں میں پڑھے، جن کی دُور اور نزدیک طرح طرح کی نشانیاں بکھری نظر آتی تھیں؛ اور وہ اچھے اور بڑے لوگ تھے جو کالج کے ساختہ پرداختہ تھے یا جنھوں نے کالج کی ساخت و پرداخت کی تھی، کالج کی نیک نامی اور خوش حالی کو اپنی نیک نامی اور خوش حالی جانتے تھے اور موقع آنے پر رفائی دستے اور انجمن صلیب احمر دونوں کے فرائض انجام دیتے تھے۔

یہ سارے عوامل براہ راست یا بالواسطہ ذاکر صاحب کے شعور پر اثر انداز تھے اور کتنی مفید و موثر دن رات کی وہ صحبتیں تھیں جو ان کو کالج میں منتخب مسلمان شریف طبقے کے ذہین اور حوصلہ مند ساتھی نوجوانوں کی حاصل تھیں، جہاں وہ اپنی اعلیٰ ذہنی و اخلاقی صلاحیتوں کو اپنے ساتھیوں کی اعلیٰ ذہنی و اخلاقی صلاحیتوں سے براہ راست وہمہ وقت کسر و انکسار میں بنتے اور سنورتے پاتے تھے۔ انسان اور اس کی زندگی کے مسائل کتنی وسعت کتنا تنوع اور کتنی گہرائی رکھتے ہیں اور فرد و جماعت کے روابط کو کس طرح استوار کرتے اور بابرکت رکھتے ہیں، ان کا بتانا آسان نہیں ہے، لیکن ذاکر صاحب کی شخصیت اور زندگی میں ان کی واضح جلوہ گری ملتی ہے۔

ذاکر صاحب کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی زندگی کے ہر پہلو سے گہری وابستگی رکھتے تھے اور اس کی تمام دلچسپ اور صحت مند سرگرمیوں میں اس انہماک سے حصہ لیتے جیسے وہ ان کا بڑا محبوب مشغلہ ہے۔ کرکٹ ہاکی فٹ بال ٹینس میں جو کالج کی زندگی میں بڑے مقبول مشاغل تھے عملاً کوئی حصہ نہیں لیتے تھے، لیکن ان سے لطف اٹھانے اور ان کے اسرار و رموز یا لطافت و ظرافت پر دلچسپ گفتگو کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ کوئی میچ یا تقریب کالج میں کہیں منعقد ہو اس کے تماشائیوں میں ذاکر صاحب ضرور ہوتے۔ کسی قابل قدر ہنر کا ماہرانہ ادراک ہو یا نہیں اس کے ہنرور کے بڑے قدر دان تھے اور اب بھی ہیں۔

کالج کی ابتدائی نصف صدی کی اقامتی زندگی اس ادارے کا بڑا قیمتی بے مثل اور دلکش امتیاز تھا

جو اس وقت تک کسی دوسرے ادارے کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ یہ وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اس کے نوجوانوں کو ایک ناقابلِ شکست شیرازے میں منسلک رکھتا ہے دوسری طرف اس کے ناموس کا نگہبان اور نشان بھی ہے۔ ذاکر صاحب اس ادارے کے اسی ابتدائی نصف صدی کی اقامتی زندگی کے پیداوار ہیں، جب یہاں کی فضا محکم عقیدۂ صالح روایات، شائستگی، تو سامندی اور وسیع النظری سے معطر و منور تھی۔ یہ عہد ایم اے او کالج کی شادمانی، شہرت و شوکت کا سب سے نمائندہ، نمایاں اور ناقابلِ فراموش عہد تھا۔

ذاکر صاحب اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ سے انٹرنس پاس کر کے علی گڑھ آئے تھے۔ طلبا کے پسندیدہ اخلاق و اطوار، اساتذہ کی فرض شناسی اور طلبا سے ہمدردی اور دوسری قابلِ قدر روایات کے اعتبار سے اٹاوہ علی گڑھ کا مثنیٰ کہا جاتا تھا۔ اس کے مشہور اور نیکنام ترین ہیڈ ماسٹر الطاف حسین صاحب مرحوم کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ ان کے طلبا جتنی ان کی عزت و محبت کرتے تھے کسی اور زندہ شخص کی نہیں کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کی ذہنی و اخلاقی صلاحیتوں کو سنوارنے اور استوار کرنے میں سید الطاف حسین صاحب کی توجہ و تربیت کا بڑا قیمتی حصہ ہے جس کا اعتراف ذاکر صاحب نے ہمیشہ بڑے احترام و عقیدت سے کیا۔

کالج سے ذاکر صاحب نے انٹرمیڈیٹ سائنس میں کیا۔ اس وقت ان کا ارادہ لکھنؤ میڈیکل کالج میں داخلہ لے کر ڈاکٹری کا کورس پورا کرنے کا تھا۔ لیکن بعد میں ارادہ بدل دیا اور علی گڑھ واپس آکر بی اے میں داخلہ لے لیا جس میں ان کے مضامین انگریزی ادب، معاشیات اور فلسفہ تھے۔ ان مضامین سے ان کو فطری مناسبت تھی۔ ان کا مطالعہ انھوں نے بڑی محنت سے کیا ہو یا نہیں بڑے شوق سے ضرور کیا۔ یہ اس لیے کہنا پڑا ہے کہ ذاکر صاحب طالب علمی کے عہد میں کسی مضمون یا تصنیف کا مطالعہ اتنی محنت سے نہیں جتنا شوق سے کرتے تھے۔ انھوں نے علم و فن میں جو عرفان و آگہی حاصل کی اس سے معمولی دوکانداروں کی طرح اتنا خود فائدہ نہیں کمایا جتنا اس علم و فن کے حدود کو آگے بڑھایا۔ بی اے کے امتحان میں نمایاں امتیاز حاصل کیا اور کالج میں

اوّل آئے۔ ایم اے میں معاشیات کا انتخاب کیا۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں ٹیوٹر مقرر ہوئے اس کے ساتھ قانون کے پہلے سال کا امتحان پاس کیا۔ اسی زمانے میں افلاطون کی مشہور کتاب ریاست کا ترجمہ اُردو میں کیا جسے بعد میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیا۔ اس پر ذاکر صاحب نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ معانی و مطالب نیز اسلوب اظہار و ابلاغ کے رُو سے بڑی فکر انگیز و دلکش تحریر ہے۔ کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب کے اس عہد کے ذہنی نشو و نما میں افلاطون اور ان کے استاد سقراط کی شخصیات اور عظیم فلسفیانہ افکار کا بڑا حصہ ہے۔ ذاکر صاحب کو ہر اچھے خیال عمل اور شخصیت سے کچھ ایسی مناسبت ہے اور ان کا ذہن بجائے خود اتنا اخاذ، خلاق، حسن کار اور حسن آفریں ہے کہ بڑے سے بڑا خیال یا شخصیت ان کے فکر و عمل میں بڑی خوبصورتی سے پیوست ہو کر ایک نئی شان اور ایک نئی معنویت حاصل کر لیتی ہے۔

اس موقع پر اپنے ایک اور احساس کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ ابتدائے طالب علمی سے آج تک سرسید کی شخصیت ان کے رفقائے کرام اور ان کے بنائے ہوئے ادارے سے مجھے جو شغف ہے اس میں جہاں اور بہت سے عوامل کی کارفرمائی ہے وہاں ذاکر صاحب کی شخصیت کو بھی بڑا دخل ہے جو تمام تر علی گڑھ کی فضا میں بالیدہ و برومند ہوئی اور علی گڑھ اور اس کے بانی کی بہترین آرزوؤں کی مظہر ہے۔ سرسید کی وہ آرزوئیں کیا تھیں اور کیسی تھیں ان پر یہاں بحث کرنے کے بجائے اس پر منصفی سے غور کرنا چاہیے کہ سرسید نے تعلیم و تربیت کے اعلیٰ علمی اخلاقی اور قومی تصور کے پیش نظر جو پروگرام ہندستان میں رہنے بسنے والے مختلف مذہب و مسلک کے پیروؤں کے لیے مرتب کیا اور اس کا نفاذ علی گڈھ میں جس خلوص اور جوش عمل سے کیا جس پر آج تک عمل ہو رہا ہے اس کی مثال ہندستان میں آج اکیانوے سال بعد بھی کہیں نظر آتی ہے یا نہیں شاید یہ بات کچھ لوگوں کو عجیب معلوم ہو اس لیے کہ تحریک عدم تعاون کی پیروی میں علی گڑھ کو خیرباد کہہ کر ذاکر صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ سے منسلک ہو گئے جو ایک طور پر علی گڑھ کی مخالفت میں قائم کی گئی تھی۔ لیکن اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جامعہ ملیہ کا قیام خود فرزندان علی گڑھ کا کارنامہ تھا۔ محمد علی، شوکت علی، عبدالمجید خواجہ اور ذاکر صاحب یہ سب علی گڑھ ہی کے تھے بکیر

بدلے ہوئے حالات میں قومیت کے بے پناہ جذبے کو ایک مثبت تعلیمی تحریک کی شکل دینا، اس کے لیے مصیبت اٹھانا، ایثار و خدمت کی مبارک اور شاندار روایت قائم کرنا جس نے ہندی مسلمانوں کی جدید ذہنی و اخلاقی تربیت میں اہم کردار ادا کیا، علی گڑھ کے تعلیمی مشن کی، علی گڑھ والوں ہی کی کوشش سے مزید توسیع تھی۔

ذاکر صاحب نے غالباً "اکتوبر ۱۹۲۰ء میں کالج چھوڑا اور قومی تعلیم و ترویج کو اپنا شعار بنایا اور خود کو اس کے لیے وقف کر دیا۔ اس وقت ایسا کرنا ایک نہایت درجہ دشوار اور صبر آزما راستے کو اختیار کرنا تھا لیکن انھوں نے یہ سب اتنے شوق، خلوص اور قابلیت سے کیا جیسے ان کو اسی دن کا انتظار تھا۔ ایک خالص سیاسی تحریک کے طوفان کو تعلیم و تہذیب کے جوئے رواں میں تبدیل کر دینا آسان نہ تھا۔ ان کے اس اقدام میں علی گڑھ کے پیر دانا کے حسن خیال اور جوش عمل کی صداقت، عظمت اور قومی ہمدردی کی بڑی مبارک نشانیاں ملتی ہیں جس نے قوم کی ذہنی و اخلاقی تربیت کو ہر چیز پر مقدم رکھا اور اس طور پر سیاست کو تعلیم کا خادم اور تابع بنا کر قومی تہذیب کے تخلیقی ارتقا کے امکانات کو واضح اور روشن کیا۔ قومی تہذیب کی محرک و مؤید صحیح معنوں میں اعلیٰ تعلیم ہی ہوتی ہے۔ علی گڑھ تحریک دراصل اسی نکتے کا ایک دلنشین اظہار تھی۔ ذاکر صاحب نے جو فیصلہ کیا تھا اس کے پیش نظر ان کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ قبل اس کے کہ وہ جامعہ ملیہ کے کاموں کو سنبھالیں مزید تعلیم و تجربہ کے لیے باہر جانا چاہیے تاکہ عصری مغربی تعلیم و تہذیب سے واقفیت نہ ہونے کے سبب ایسی دقتیں پیش نہ آئیں جو آئندہ ایک ترقی پذیر تعلیمی پروگرام کی تشکیل و تکمیل میں مانع ہوں۔

۱۹۲۲ء میں ذاکر صاحب جرمنی کے لیے روانہ ہوئے اور برلن یونیورسٹی میں اقتصادیات میں پی ایچ ڈی لینے کے لیے داخلہ لیا۔ ساڑھے تین سال وہاں مقیم رہے۔ اس عرصے میں نہ صرف یہ کہ "برطانوی ہند میں زراعت" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ پیش کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کی بلکہ جرمنی اور دوسرے ملکوں کی تہذیب و تمدن بالخصوص ان کے تعلیمی نظام کا گہرا مطالعہ کیا۔ جن لوگوں نے وہاں ذاکر صاحب کو دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے اس دوران میں ان تعلیمی تجربات کا

خاکہ تیار کیا جو بعد میں ان کی رہنمائی میں جامعہ میں نافذ کیے گیے۔ یہاں بھی ذاکر صاحب کے عمل کا انداز
سرسید کے طریقِ عمل سے کس درجہ مماثلت رکھتا ہے جو ان کے قیام انگلستان میں بروے
کار آیا جہاں سرسید نے اپنا تمام وقت اور توجہ قوم کے سود و بہبود سے متعلق تعلیمی پروگرام
مرتب کرنے میں صرف کیا۔ برلن یونیورسٹی میں ذاکر صاحب کے استاد مشہور جرمن ماہر معاشیات
پروفیسر زومبارٹ تھے جن کی اس وقت کے جرمنی کے
اعلیٰ علمی حلقوں میں بڑی منزلت تھی۔ اقتصادیات میں پروفیسر موصوف کا مخصوص مطالعہ معاشی
نظام خاص طور پر سرمایہ داری نظام کے ارتقا اس کی ہیئت، طریقہ کار اور مقاصد سے متعلق
تھا اور ان موضوعات پر ان کی بڑے معرکے کی تصانیف ہیں جن میں سے بعض کا انگریزی ترجمہ
ہو چکا ہے۔ پروفیسر زومبارٹ کے خیالات کا ذاکر صاحب کے اقتصادی نظریات پر نمایاں اثر
پڑا۔ پروفیسر زومبارٹ کے خلاف ان کے دوسرے پروفیسر پروفیسر زیرنگ
تھے جن کی نگرانی میں ذاکر صاحب نے اپنی ڈاکٹریٹ کا مقالہ زراعتی معاشیات
لکھا تھا۔ اس کا اندازہ ذاکر صاحب کے ان دو لکچروں کے مطالعے سے ہوتا ہے جو انھوں نے
مختلف موقعوں پر دیے اور بعد میں شائع بھی ہوئے۔ پہلے لکچر ہندستانی اکاڈمی الہ آباد کی فرمائش
پر دیے گئے جو "معاشیات مقصد و منہاج" کے نام سے اُردو میں چھپے؛ دوسرے لکچر
کیکا بھائی پریم چند جی لکچر کے نام سے دہلی یونیورسٹی کی دعوت پر دیے گئے۔ ان کے علاوہ

انھوں نے معاشیات کی دو مستند کتابوں کا ترجمہ کیا ایک ایڈورڈ کینن کی اصولِ معاشیات
اور دوسری فریڈرش لسٹ کی
کتاب معاشیات قومی کا۔ اس طور پر کہہ سکتے ہیں کہ معاشیات میں ذاکر صاحب کی خصوصی دلچسپی ان
مضامین سے تھی جو بنیادی طور پر فلسفیانہ معاشیات یا معاشی عمرانیات سے متعلق تھے۔ یوں ان کا
معاشیات کا عام مطالعہ نہایت وسیع ہے اور وہ ان تمام جدید تبدیلیوں سے پورے طور پر آشنا
ہیں جو اس علم میں بڑی تیزی سے راہ پا رہی ہیں جن کو سمجھنے کے لیے مخصوص و مسلسل مطالعہ
درکار ہے۔

ذاکر صاحب کو دوسری دلچسپی تعلیم کے مضمون سے تھی۔ بعد میں کچھ ایسا ہوا کہ معاشیات کی بجائے تعلیم ہی ان کا خاص مضمون بن گئی۔ یہاں تک کہ اب ملک کے اندر اور باہر وہ ایک ممتاز ماہر تعلیم کی حیثیت سے زیادہ جانے پہچانے جاتے ہیں اور یہ صحیح بھی ہے۔ جرمن سے واپس آکر انھوں نے تعلیم ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور عمر کا بیشتر اور بہترین زمانہ اسی کی نظر کیا یہاں تک کہ جدید ہندستانی تعلیمی نظام کی تشکیل و تعمیر میں ان کے تعلیمی افکار کو بجا طور پر بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس موضوع پر ذاکر صاحب نے اُردو میں جو کچھ لکھا وہ تعلیمی خطبات کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی میں متعدد لکچر ہیں جو کتابی شکل میں یکجا نہیں ملتے لیکن شائع ہو چکے ہیں اور ملک کے تعلیمی حلقوں میں معروف و مشہور ہیں۔ حال میں ان کی ایک کتاب

انگریزی میں شائع ہوئی ہے

جو ان کی تخلیقی فکر کا قابل قدر نمونہ ہے۔ ان کے علاوہ ملک کی تعلیم کے سلسلے میں ذاکر صاحب کی تاریخی خدمت اس رپورٹ سے عبارت ہے جو گاندھی جی کے ایما پر مرتب ہوئی اور عام طور پر واردھا ایجوکیشن رپورٹ کے نام سے معروف ہے۔

ذاکر صاحب کے تعلیمی افکار و نظریات کی ابتدائی تشکیل و تعمیر میں اس گہرے مشاہدے اور مطالعے کو خاص دخل ہے جو ان کو جرمنی کے زمانۂ قیام میں میسّر آئے۔ اس میں دو نام قابل ذکر ہیں جن سے ذاکر صاحب گہرے طور پر متاثر ہوئے۔ ایک مشہور جرمن عالم کرشن اشپرانز

دوسرے ممتاز و معروف سوئستانی ماہر تعلیم

پستالوزی

اس وقت وہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے اس لیے کہ وہ جامعہ کو ایسا ادارہ بنانا چاہتے تھے جو ملک میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی نہ صرف بنیادی تعلیم گاہ بلکہ تجربہ گاہ بھی ہو۔ قومی سیرت اور ذہن کی اساسی تعمیر اصلاً "ابتدائی اور ثانوی تعلیم ہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ معاشی اور سماجی اعتبار سے ہندستان ایک زراعتی ملک ہے جس کی تین چوتھائی سے زیادہ آبادی دیہات میں بود و باش رکھتی ہے۔ انگریزی حکومت نے جو نظام تعلیم رائج کیا تھا وہ کل آبادی کی صرف ایک محدود تعداد کی تعلیمی ضرورتوں

کو بھی ناکافی حد تک پورا کرتا تھا۔ ذاکر صاحب اس کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے تھے۔ ان کی آرزو اور کوشش یہ تھی کہ قومی ترقی اور فلاح کے لیے ایک ایسے جامع تعلیمی منصوبے کی تشکیل کی جائے جو بچوں کی آزاد صحت منداور مبارک ذہنی و جسمانی نشو ونما اور تربیت میں اعلیٰ قومی اقدار اور ایک صالح معاشرے کو فروغ دینے میں معین ہو۔

ذاکر صاحب ہندستان واپس آئے تو یورپ کی بہترین متاع یعنی ترقی یافتہ تعلیمی افکار و نظریات اپنے ساتھ لائے اور آتے ہی اپنے وعدے اور منصوبے کے مطابق جامعہ کے کاموں کو سنبھال لیا یہ مہم جتنی اہم تھی اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مادی ذرائع اور وسائل کی اتنی ہی کمی تھی۔ جن لوگوں نے یہ کام شروع کیا تھا ان کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ ابتدائی جوش اور ولولہ سرد پڑنے لگا تھا۔ ملک کی سیاسی فضا تیزی سے مکدر ہو رہی تھی اور جامعہ کو پروان چڑھانا ناممکن نظر آرہا تھا۔ یہ محض ذاکر صاحب کی شخصیت کا اعجاز تھا کہ تھکے ہارے ساتھی تازہ دم ہوئے اور انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں ایک عہد آفریں تعلیمی پروگرام کو کامیاب بنانے کی عظیم مہم میں دل و جان سے شریک ہو گئے۔ جن لوگوں نے ذاکر صاحب کے وہ دن و رات دیکھے ہیں ان کو یاد ہو گا کہ جامعہ کے جانبازوں اور ان کے شیخ نے کتنے دل شکن حالات میں کس دل جمعی اور پامردی کا ثبوت دیا۔ رضاکارانہ طور پر اپنے کو بے سروسامان رکھ کر قوم کے لیے کیسے ساز و سامان فراہم کیے۔ پسینہ پانی ایک کر کے کتنی سنگلاخ زمین کو کتنا زرخیز بنا دیا اور اتنا کچھ کر ڈالنے کے بعد اپنا کوئی حق نہیں جتایا۔ علم تہذیب اور انسانیت کی خاطر اس جماعت نے جو کچھ کر دکھایا اس کی یاد ملک و قوم کے دلوں کو ہمیشہ تازہ اور توانا رکھے گی۔

علی گڑھ سے جامعہ دہلی منتقل ہوئی تو قرول باغ کے علاقے میں کرایے کے مکانات میں اس کا کام شروع ہوا۔ غالباً اس کی اپنی عمارت کوئی نہ تھی۔ اسکول و کالج کہیں تھے تو دفتر اور اقامت گاہیں کہیں اور تعلیم بالغان کا مرکز یہاں تھا تو مکتبہ جامعہ وہاں۔ لیکن ان دشواریوں کے باوجود جامعہ کا کام دیکھیے تو نہایت درجہ منظم مرتب اور بامقصد ادارے کا احساس ہوتا تھا۔ ہر کام قاعدے اور

وقت کی پابندی سے انجام پاتا تھا۔ بحیثیت مجموعی اس زمانے میں قرول باغ کی بستی بڑی ناصاف، ناصحت مند، وحشت انگیز اور ویران تھی لیکن جامعہ کے طفیل اس کی یہ خرابیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ وہاں جائیے تو جامعہ ذاکر صاحب اور ان کے رفقاء اور ان کے کاموں کے تصور سے ایسا محسوس ہوتا جیسے پورے علاقے کی فضا جامعہ کی فضا میں تبدیل یا تحلیل ہوتی جارہی ہو۔ جامعہ والے اس بستی کو اپنی بساط اور وسائل سے زیادہ صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کرتے۔ ذاکر صاحب کا مکان بہت مختصر لیکن اندر باہر صفائی سادگی اور سلیقے کا نمونہ تھا۔ ذاکر صاحب کی بوریہ نشینی میں سلطانی کی شان تھی۔ جو ملنے جاتا اسے احساس ہوتا کہ قوم کی تقدیر دتاریخ میں وہ مبارک موڑ آچکا ہے جس کے ہم منتظر و متمنی تھے اور اب جب کہ وہ مسند حکومت پر متمکن ہیں صدر کا ایوان اتنا مرکز حشمت و قوت نہیں معلوم ہوتا جتنا ایک ایسے مامن کا جہاں اعلیٰ مقاصد قومی کا تعین اور ان کے حصول کی مناسب تدابیر عمل میں آتی ہیں اور جس کا مکین نئے ہندستان میں ایک مہذب منصفانہ اور صلح کل معاشرے کا نقیب بھی ہے اور نمائندہ بھی۔

ذاکر صاحب کی قیادت میں رفتہ رفتہ ملک میں جامعہ کی ساکھ قائم ہوئی۔ اس کی افادیت و اہمیت کا احساس عام ہونے لگا۔ دلی کے ہجوم و ہیجان اور دارو گیر سے دور اوکھلے میں ایک وسیع قطعے پر اس کی عمارتیں بننا شروع ہوئیں اور دیکھتے دیکھتے ایک اجلی ستھری تعلیمی بستی آباد ہو گئی۔ جامعہ کی عمارات دلی کی تاریخ و تہذیبی عمارات کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ذاکر صاحب کے اعلیٰ تعمیری ذہن اور ذوق کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ ہیئت و ساخت اور ان کے معنی و متن میں ذاکر صاحب کی امید و عزائم پیوست ہیں۔ حالی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو سرسید نے بڑے چاؤ اور امنگ سے بنایا جیسے کوئی اپنا گھر بناتا ہے اور وہ خود اس کے انجینیر معمار مزدور اور قلی تھے۔ کم و بیش یہی کیفیت ذاکر صاحب کی تھی۔ جامعہ کو گھر مل گیا۔ کاموں میں وسعت اور برکت ہوئی اس طور پر ملک میں ایک صحت مند اور امید افزا روایت کا اضافہ ہوا۔

جامعہ نے غالباً ۱۹۴۶ء میں اپنی زندگی کے پچیس سال پورے کیے تو اس کی خدمت کے اعتراف میں

ایک جشن منایا گیا۔ کس آشوب و آزمائش کا وہ دور تھا۔ ملک میں سیاسی منافرت و عداوت اس درجہ پھیل گئی تھی کہ ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے یہاں نہ کبھی یگانگت تھی نہ ہو سکتی تھی۔ ایسے میں کسی ایسی تقریب کی طرح ڈالنا جس میں سب اتفاق و یکجہتی سے شریک ہوں ناممکن العمل نظر آتا تھا۔ اسے ذاکر صاحب اور ان کے ادارے کی کرامت کہنا چاہیے کہ ان کی دعوت پر جامعہ کے اس جشن جوبلی میں سبھی شریک ہوئے ڈائس پر کون نہیں موجود تھا۔ جواہر لال نہرو محمد علی جناح راج گوپال اچاری مولانا ابوالکلام آزاد سید حسن نواب بھوپال لیاقت علی خان عبدالمجید خواجہ۔ اس زمانے کی عصیان و عداوت کے سیل و صرصر کو ذہن میں رکھیں تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ جہاں پنڈت جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح یکجا نظر آئیں وہاں کیسے کیسے لوگ یکجا نہ ہو گئے ہوں گے۔

ذاکر صاحب ان دنوں علیل تھے۔ خطبہ پڑھنے اٹھے تو سب کی نظریں ان پر جم کر رہ گئیں۔ وہ خطبہ بھی کیا تھا اور اس میں کیا کچھ نہ تھا۔ کتنی فکر انگیز اور سچی باتیں کس خلوص اعتماد اور دردمندی سے کتنا سچا اور پکا آدمی قوم و ملک کے کس قدر نمائندہ مجمعے کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ معلوم ہوا۔ جیسے اس طوفان کا منہ پھر جائے گا جو ہر اچھے فکر و عمل کو تہ و بالا اور تہس نہس کر رہا تھا اور امید و الفت کا وہ سورج جو گہنا رہا تھا از سر نو جگمگانے لگے گا۔ سب کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے قوم کا ضمیر خود قوم سے مخاطب ہو۔ ذاکر صاحب کی اس تقریر سے طوفان تو نہ تھما اور جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ لیکن ملک کی آئندہ جو تاریخ لکھی جائے گی اس میں اس حقیقت کا اظہار ہوگا کہ اس پُر محن دور میں انصاف شرافت اور انسانیت کی حمایت میں ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر جن لوگوں نے اپنی آواز بلند کی اور تعصب تنگدلی اور جہالت سے نبرد آزما ہوئے ان میں ذاکر صاحب کا نام بہت ممتاز ہے۔

جامعہ کی عام رہنمائی اور اس کے کاموں کی مسلسل نگہداشت کے علاوہ ذاکر صاحب کی بے شمار

مصروفیات تھیں۔ وار دھا تعلیمی رپورٹ کے شائع ہوجانے کے بعد خاص طور پر جب کانگریس نے غالباً ۳۸ - ۱۹۳۷ء کے ہری پورہ سیشن میں اس کو پارٹی پروگرام کی حیثیت سے قبول کرلیا تھا، ذاکر صاحب پر ذمہ داری کا ایک اور بوجھ آن پڑا۔ ملک کے دور دراز علاقوں کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ مختلف جلسوں اور اداروں میں رپورٹ کی وضاحت کرنی ہوتی اور بحث مباحثے میں حصہ لینا پڑتا تھا۔ گاندھی جی نے جن کی بیشمار مصروفیتیں تھیں، اس لیے بنیادی تعلیمی پروگرام کی سربراہی کا سارا کام ذاکر صاحب کو سونپ دیا تھا۔ گاندھی جی کے اس اعتماد کا ذاکر صاحب پر بڑا اثر تھا۔ دونوں اعلیٰ اخلاقی رجحان رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ ملک میں بنیادی تعلیمی پروگرام کو پارٹی یا اس کی حکومت کے اثر و اقتدار کو کام میں لاکر نافذ نہ کیا جائے بلکہ آزاد بحث و مباحثہ اور افہام و تفہیم کے ذریعہ اس سے صحیح واقفیت پیدا کرائی جائے اور یہی طریقہ کار خیال اور عمل میں حقیقی اتحاد و یکجہتی کا باعث ہوگا۔ یوں بھی ذاکر صاحب کو محض اپنی بات منوانے کی اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی زیر بحث مسئلے کے تمام پہلوؤں کی تشریح و وضاحت اور اس کے اسباب و نتائج کو دوسروں کو سمجھانے کی۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے بنیادی تعلیم کے منصوبے کا مقصد ملک میں ابتدائی تعلیم کو یکسر نئی اور صحت مند بنیادوں پر قائم کرنا تھا اور نوخیز نسل کو با مقصد با معنی اور تخلیقی صلاحیتوں کے نشو و نما سے بہرہ مند کرنا تھا۔ عام ذہن مروجہ تعلیمی نظام میں معمولی تبدیلیوں ہی کو کافی سمجھتا تھا اس لیے جب یہ پروگرام سامنے آیا تو کچھ عدم واقفیت کی بنا پر اور کچھ اس لیے کہ دیرینہ مفادات کو اس تبدیلی سے نقصان پہنچے گا اکثر مذہبی نقطۂ نظر یا سیاسی عصبیت کے باعث اس کی طرح طرح سے تاویلیں کی گئیں اور مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ذاکر صاحب کو اس اسکیم کی جوابدہی کرنی پڑتی تھی۔ اس حوصلہ شکن و صبر آزما صورتِ حال سے ذاکر صاحب جس مستقل مزاجی اور قابلیت سے عہدہ برآ ہوئے وہ ان کا بڑا قابلِ تعریف کارنامہ ہے۔ ملک میں جا بجا بنیادی تعلیم کا کام شروع ہوا لیکن اتنے بڑے ملک میں اتنے بڑے کام کو ہر جگہ یکساں کامیابی سے پھیلانے میں بیشمار دشواریاں حائل تھیں۔ پھر یہ کہ سیاست اور مذہب کے

"دریائے بے پایاں وطوفان موج افزا" میں تعلیم کی کشتی زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ بنیادی تعلیم کا کام جن توقعات اور حوصلہ کے ساتھ شروع کیا گیا تھا وہ پورا نہ ہوا لیکن اس کی ذمہ داری ان پر نہیں ہے جنھوں نے اسے وضع کیا تھا بلکہ ان پر ہے جو اسے چلا نہ سکے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندستان آزاد ہوا تو ذاکر صاحب دہلی میں تھے۔ بحالی صحت کے لیے کشمیر جارہے تھے کہ جالندھر کا حادثہ پیش آیا جس کا ذکر ابتدائی صفحات میں آچکا ہے۔ دلی واپس پہنچے تو عالم میں انتخاب، یہ شہر دہشت اور درندگی کے لپیٹ میں آچکا تھا۔ مسلمانوں پر قہر و قیامت کا صور مسلسل پھونکا جارہا تھا۔ ان کے لیے عرصۂ حیات قبر کی طرح تیرہ و تنگ ہوچکا تھا اور دلی کا گنج شائگاں گنج شہیداں کا سماں پیش کر رہا تھا۔ مسلمان پارہ پارہ ہوچکے تھے۔ شقاوت و شیطنت کے اس مکروہ و مہیب منظر کے ساتھ انسانیت محبت اور غیرت کی جھلک بھی دیکھنے میں آتی تھی۔ گاندھی جی مولانا ابوالکلام آزاد جواہر لال نہرو ذاکر صاحب مولانا حفظ الرحمن شفیق الرحمن قدوائی بے بس اور بے سہارا مسلمانوں کو پناہ اور تشفی دینے کے لیے ہر انجام و انعام سے بے پروا ہوکر سینہ سپر تھے۔ بالآخر آگ خون اور خباثت کا طوفان قابو میں آیا لیکن کس طرح کس وقت اور کس قیمت پر ہندستانی انسانیت کی سب سے گرانمایہ شخصیت عالمگیر صلح و آشتی کے عظیم پیامبر اور مذہب و اخلاق کے بہت بڑے نمونہ و نمائندہ گاندھی جی کی جان کی نذر لے کر۔ جیسے دلی والوں کے اس دیرینہ توہم کی تصدیق ہوگئی ہو کہ جب تک وبا یا ابتلائے عام کسی بڑے آدمی کی جان نہیں لے لیتی فرو نہیں ہوتی۔

ایسی بے قراری اور خطرے کے ان دنوں میں ذاکر صاحب نے جس اعتماد و عزم اور جس خلوص و خاموشی سے بگڑی اور بگڑتی ہوئی صورت حال کا مقابلہ کیا اور جس طرح تباہ حال مسلمانوں کو تسکین دینے اور حوصلہ دلانے میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں اس کا اعتراف سب نے کیا۔ یہ عمل اگر ایک طرف ان کے سچے اور پکے مسلمان ہونے پر دلالت کرتا ہے تو دوسری طرف ان کے سچے اور پکے وطن دوست ہونے کی بھی دلیل ہے۔ ذاکر صاحب شب و روز مصروف رہتے جامعہ کے کاموں کے

علاوہ طرح طرح کی دوسری ذمہ داریوں سے سابقہ ہوا۔ دلی کی مظلوم انسانیت کے تقاضے ان کی مسلسل توجہ چاہتے تھے۔ قومی حکومت کے تعلیمی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے سلسلے میں تمام متعلق کمیٹیوں اور کونسلوں میں شرکت کرنا لازمی سا ہوگیا تھا۔ یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کے رکن تھے جو حصول آزادی کے بعد تعلیم کے مسائل پر مفصل رپورٹ پیش کرنے کے لیے مامور کیا گیا تھا۔ آزادی کے بعد کے کچھ دن انھی مصروفیتوں کی نذر ہو گئے۔ نومبر ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ نے باتفاقِ آرا ذاکر صاحب کو وائس چانسلر منتخب کیا۔

علی گڑھ پر بڑا سخت وقت گذر رہا تھا جیسے کسی لرزہ خیز زلزلہ کی زد میں ہو۔ پورے ملک میں اس وقت ذاکر صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا جو اس عظیم علمی تعلیمی تاریخی اور تہذیبی ادارے کو بچانے اور بحال کرنے کی بے کراں دبے امان ذمہ داری قبول کرنے کا اہل ہوتا یا اس کی ہمت کرتا۔ آزادی سے چند سال پہلے ہندستانی سیاست نے جو رنگ و رخ اختیار کیا تھا اس سے علی گڑھ شدید طور پر متاثر ہوا تھا۔ اس لیے تقسیم ملک کے بعد پورے ملک میں تعصب و تخریب کے جو عناصر ابھرے علی گڑھ ان کا خاص نشانہ بنا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اس لیے اور کسی کے بوتے کا نہ تھا کہ جو صورت حال رونما تھی اور تیزی سے بگڑتی جا رہی تھی اس میں کیا کیجیے کہاں جائیے کیا ہوگا اور کس سے رجوع کریے۔ علی گڑھ کے چھوٹے بڑے سب دم بخود تھے۔ جو ہونا چاہیے تھا اس کا ان کو احساس تھا۔ جو کچھ ہوا تھا اس کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار تھے۔ دوسرے جو چاہتے تھے اس سے بھی بُرے بھلے واقف تھے۔ جو نئی ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں ان سے بھی خاطر خواہ طور پر عہدہ برآ ہونے پر آمادہ تھے لیکن یہ سب کیسے ہوتا اور کون کرتا، یہ وہ نہیں جانتے تھے۔

ستر پچھتر سال کی طویل مدت میں اس ادارے نے جو اچھے اور بڑے کام کیے تھے ان کو محض ایک سیاسی حادثے کی بنا پر نظرانداز کر دیا جائے، نہ مقتضائے انصاف تھا نہ قرین دانشمندی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات نے ملک کو اس طرح زیر و زبر کر دیا تھا کہ شاید ہی کوئی ادارہ، جماعت، یا جگہ

یا کسی و ناکس اس سے متاثر ہونے سے محفوظ رہا ہو۔ علی گڑھ کے لیے جتنی غلط بات یہ تھی کہ وہ ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے کے منصب کو نظر انداز کر کے سیاست کے شور و فتن میں داخل ہوا اس سے بھی زیادہ غلط بات یہ ہوتی کہ اس کے بدلے اس کو مٹا دینے کو عملِ نیک قرار دیا جاتا۔ اگر آزادی کے معنی ہندستان میں ایک نئی انصاف پسند اور جمہوری ریاست کا قائم کرنا تھا تو اس ریاست کے قیام اور کامیابی کی اولین شرط یہ تھی کہ ماضی کے ناخوشگوار واقعات اور حالات کے مہلک سلسلے اور اس کے اثرات سے مستقبل کو محفوظ کیا جائے۔ ذاکر صاحب نے اس وقت علی گڑھ کی قیادت کی ذمہ داری قبول کر کے اس بات کو واضح طور پر ثابت کر دیا کہ نئی ہندستانی ریاست کا بنیادی مقصد ایک مہذب ترقی پسند اور انصاف دوست معاشرے کو قائم کرنا ہے اور علی گڑھ کی بقا اور توسیع کا کام اس مقصد کے حصول میں ایک موثر اور مبارک وسیلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذاکر صاحب کا یہ کوئی نیا خیال نہ تھا۔ ان کی پوری زندگی اس مقصد کی نہایت مستند روشن اور دلکش تصویر و تعبیر رہی ہے۔

ذاکر صاحب علی گڑھ آ گئے۔ لسان الغیب نے بشارت دی "یوسفِ گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور" عندلیبِ باغِ حجاز کی دعا پہنچی "کلی کلی ہو تری گرمیِ نوا سے گداز" اور محسوس ہونے لگا جیسے ہم سب ایک بار پھر اپنی اس کھوئی ہوئی فردوس میں آباد ہیں جس کو اقبال نے آغوشِ مادر کہہ کر کھوئی ہوئی فردوس سے بھی زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔ یہ آنا علی گڑھ اور ذاکر صاحب کے درمیان ایک دیرینہ پیمانِ وفا کی تجدید ایک نئی زندگی کا طلوع اور نئے چیلنج کو قبول کرنے کا عزم و اعلان تھا۔ شکستہ بال دل گرفتہ اور پابستہ مرغانِ چمن فرطِ مسرت سے زمزمہ سنج ہو گئے۔

ذاکر صاحب کی موجودگی ان کے کام کرنے اور کام لینے کا انداز دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک حد تک سر سید کا عہد واپس آ گیا ہو اور تباہی اور مایوسی کے ریگ زار میں تخلیق و تعمیر کے جا بجا نخلستان ابھرنے اور لہلہانے لگے ہوں۔ ذاکر صاحب مدتوں سے یونیورسٹی کی اکزیکٹو

کونسل، اکیڈمک کونسل اور شعبہ اقتصادیات کے ممبر رہے تھے۔ یوں بھی وہ یونیورسٹی اور اراکین اسٹاف سے ذاتی طور پر متعارف تھے۔ بلکہ یہ کہنا بھی حقیقت سے دور نہ ہوگا کہ ذاکر صاحب جب یہاں کے طالب علم تھے اس زمانہ سے آج تک جب کہ وہ جمہوریہ ہند کے صدر ہیں ان کی اعلیٰ سیرت و شخصیت علم و فن سے شیفتگی، عوام و خواص دونوں میں احترام و محبت کی نظر سے دیکھے جانے اور طالب علموں سے ہمدردی رکھنے کا چرچا جتنا علی گڑھ میں رہا اور اب تک ہے شاید ہی کسی اور کا کبھی رہا ہو۔ ان کے ذہن میں یونیورسٹی کے آیندہ نشیب و فراز کے سارے پیچ و خم کا نقشہ تھا اس لیے اس ادارے کے انتظام و انصرام میں جو ان کے لیے اتنا ادارہ نہیں جتنا گہوارہ تھا کوئی وقت پیش نہ آئی۔ ہر کام دیکھتے دیکھتے اس خوش اسلوبی سے انجام پانے لگا جیسے خوش اسلوبی سے انجام پانا ان کاموں کا خاصہ ہو۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ مواعظ حسنہ اور سب و شتم کے ان خطبات افتتاحیہ سے ہم محفوظ ہو گئے جو ہر کس و ناکس اختیار کے نشہ یا اقتدار کی جستجو میں علی گڑھ آتا اور یہاں کی تواضع و تکریم سے آسودہ ہو کر ہم کو سنا جاتا۔ ذاکر صاحب کے آجانے سے درد و درماندگی اور خوف و دشواری کے وہ دن ختم ہوئے اور ہم کو اس ناقابل بیان و برداشت کلفت و کوفت سے نجات ملی۔ اس زمانے اور ان حالات میں یہ کارنامہ کسی اور کے بس کا نہ تھا۔ پھر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بڑے سے بڑا شخص خواہ وہ اپنے عہد کا کیسا ہی علامہ یا عالی جاہ کیوں نہ ہوتا علی گڑھ آکر ہم کو خطاب کرنے کی جرأت کرتا تو سب سے پہلے ذاکر صاحب کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت پیش کرتا اور جو کچھ کہتا اور جس طرح کہتا انداز وہی ہوتا جیسے استاد کے سامنے اس کی اجازت لے کر پورے آداب و اکرام کے ساتھ شاگرد مشاعرے میں اپنا کلام سناتے ہیں۔

ذاکر صاحب کے طریقہ کار کا بڑا دل آویز پہلو یہ ہے کہ انھوں نے کام کرنے یا کام لینے میں منصب کو بطور قوت یا سیاست کے کبھی نہیں استعمال کیا۔ ان کو جتنا بھروسہ اپنی خیر اندیشی اور دوسروں کی اچھائی پر ہے اتنا منصب پر نہیں۔ جیتنے کا اس سے بڑا حربہ اب تک دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اس حربہ کا استعمال اتنا آسان نہیں۔ ذرا غفلت ہوئی اور آدمی خود اس کا شکار ہو گیا۔ علی گڑھ

میں ذاکر صاحب محض وائس چانسلر نہ تھے جو بندھے ٹکے دفتری یا انتظامی طور طریقوں سے کام لینے اور کرنے کو سب کچھ جانتے ہوں۔ ان کی وائس چانسلری ایک عالی صفات شخص کی قیادت تھی جس پر نہ صرف علی گڑھ کو بلکہ اس کے باہر بھی ہر چھوٹے بڑے کو اعتماد و افتخار تھا۔ اس طور پر ذاکر صاحب کے عہد میں علی گڑھ نئے ہندستان میں اعلیٰ علمی تعلیمی و تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ علی گڑھ کا شروع سے یہی رول بھی رہا ہے۔ اپنے حسن عمل سے جب تک وہ اس کو ادا کرتا رہے گا اس کی افادیت و اہمیت مسلّم رہے گی۔ اور یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی۔ اس طرح ادارے صرف اپنے اعلیٰ بنیادی مقاصد کی توسیع، ترقی و تکمیل ہی میں زندہ اور نفع بخش رہتے ہیں۔ ان کو مصالح و مقاصد کے تابع کرنا ایسا ہی ہے جیسے تازہ اور صحت بخش ہوا اور پانی کو مسموم و متعفن کرنا اور رکھنا۔

انگریز اساتذہ کے عہد (ایم اے او کالج) میں تفریحی ورزش کھیلوں اور ان کی صحیح اسپرٹ (اسپورٹس مین شپ) کو تعلیم و تربیت اور معلومات زندگی کا جس طرح اور جس حد تک جز بنا دیا گیا تھا جس کے سبب سے علی گڑھ کے عام طلبا دوسروں سے نمایاں طور پر ممتاز تھے اس کو ذاکر صاحب نے بڑے شوق اصرار و اہتمام سے از سر نو نافذ کیا تھا۔ ذاکر صاحب کی طالب علمی کے زمانے میں ایم اے او کالج نے جو ناموری و نیکنامی حاصل کی تھی وہ صرف کھیلوں کے میدان تک محدود نہ تھی بلکہ یہاں کے طلبا اور کالج کے جملہ متعلقین و متوسلین کی روزانہ کی زندگی میں نظر آتی تھی۔ اس کا سبب یہ نہ تھا کہ علی گڑھ کے طلبا آسمان سے نازل یا روس اور امریکہ سے آیا کرتے تھے بلکہ ان میں اسپورٹس کی روح اس درجہ سرایت کر چکی ہوتی تھی کہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر خود کھیل کے فن میں ان کو غیر معمولی مہارت حاصل ہو جاتی تھی۔ آج بھی جب کہ حالات سازگار نہیں ہیں، علی گڑھ کے طلبا میں اسپورٹس مین شپ کی روایت تازہ و تابندہ ہے اور یہ واضح علامت اس کی ہے کہ اس کی سرشت صالح ہے اور وہ ان روایات عظیمہ اور اقدار عالیہ کا احترام کرتے ہیں جن کا ایک نام علی گڑھ بھی ہے۔

آج کل طرح طرح کے کھیلوں کو جو ترقی دی جا رہی ہے اور ان پر جو کثیر رقم صرف کی جاتی ہے کیسے

نہیں معلوم لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ان کھیلوں سے اسپورٹس مین شپ نہ صرف معدوم ہو چکی ہے بلکہ ناسمجھی سے اس کو ایسے ماحول میں ڈال دیا گیا ہے اور ایسے ہاتھوں میں دے دیا گیا ہے جو اسپورٹس کو عبادت اور ذمہ داری نہیں پیشہ قرار دیتے ہیں۔ اور پیشہ بھی ادنیٰ درجے کا۔ جیسے اسپورٹس کا مقصد ذہن واخلاق کی شائستگی نہیں لاٹھی چارج ہو۔ اسپورٹس بازاروں میں نہیں بنتے۔ ان کی نشوونما علم واخلاق کی مانند اچھی تعلیم گاہوں میں اساتذہ کی نگرانی اور تہذیبی روایات کے سائے میں ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ذاکر صاحب نے ایک موقع پر علی گڑھ کے کھلاڑیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

> عزیزو یہ بات اچھی نہیں ہے کہ کھیلوں کے میدان بالخصوص علی گڑھ میں تمہارے اچھے کھیلنے پر تمہارے ساتھی تمہاری تحسین کریں اور فریق مخالف کے اچھے کھیل پر خاموش رہیں یا اس کی کسی معذوری یا نارسائی پر اس کا مضحکہ اڑائیں۔ یہ کھیل اور شائستگی دونوں کے آداب کے خلاف ہے۔ اگر تم دیکھو کہ ایسا ماحول ہو رہا ہے تو کھیل بند کر دو اور اس پر اصرار کرو کہ جب تک مقابل ٹیم کے کھلاڑیوں کے کھیل کی خاطر خواہ داد نہ دی جائے گی تم کھیلنا ملتوی رکھو گے۔

ذاکر صاحب جانتے تھے کہ نئے ہندستان کا جو نقشہ بنے گا اور اس کو جن نئے احوال سے سابقہ ہوگا اس میں صحیح وصالح خطوط پر نوجوانوں کی تنظیم کا مسئلہ سب سے اہم ہوگا۔ اس لیے وہ طلبا میں زیادہ سے زیادہ اسپورٹس مین شپ پیدا کرنے کے خواہاں اور کوشاں تھے۔ اور ان کا خیال صحیح تھا۔ آج کے نوجوانوں میں ڈسپلن کے فقدان سے جو خطرہ ہے وہ تمام دوسرے خطروں سے زیادہ ہے۔ سیاسی ناخداؤں کو کوئی سمجھائے کہ جب تک جمہوری نظام میں صحیح سیاسی و جمہوری شعور نہ پیدا ہو جائے نوجوانوں کی تنظیم سیاسی مقاصد و مصالح کی سطح پر نہیں اسپورٹس اور اخلاق کی سطح پر کرنا چاہیے۔ لیکن خود غرضی اور تنگ نظری اس کی مہلت یا اجازت نہیں دیتی تو نوجوانوں کی موجودہ بے راہ روی کا ماتم کرنا صرف فعل عبث ہے۔

ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کا زمانہ کم وبیش آٹھ سال رہا۔ اس عرصے میں کتنے بڑے ادارے

میں کتنے بڑے بڑے کام انجام پا گئے اُن کا احاطہ کرنا آسان نہیں۔ طلبا کی اعلیٰ ذہنی و اخلاقی تربیت و نشو و نما کے لیے نئے مواقع اور نئی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ درس و تدریس کا کام زیادہ دلسوزی اور یکسوئی سے ہونے لگا۔ لیبوریٹریوں کے لیے ضروری اور جدید آلات و سامان فراہم کیے گئے۔ اساتذہ کی بڑی تعداد کو تعلیمی رخصت دے کر باہر بھیجا گیا تاکہ وہ اپنے مضامین میں مزید لیاقت حاصل کر سکیں، سنجیدہ تصنیف و تالیف اور توسیعی خطبات کا بڑے پیمانے پر انتظام ہوا۔ طلبا کی اقامتی زندگی اور سرگرمیوں کو زیادہ بامقصد دلچسپ اور راحت رساں بنانے پر خاص طور سے زور دیا گیا۔ حفظانِ صحت کی تدابیر کو وسیع پیمانے پر نافذ کیا گیا۔ خوبصورت کارآمد اور ضروری عمارات تیار ہوئیں۔ یونیورسٹی کے خطے کو صحت بخش اور دلکشا بنانے کے لیے وسیع پیمانے پر چمن بندی کی گئی اور باغات لگائے گئے۔ افتادہ زمینوں میں کاشتکاری شروع کی گئی۔ باہر کی علمی دنیا سے بہتر روابط قائم کیے گئے۔ انھوں نے دینیات و اسلامیات کے نصاب پر مستند علما کی نظرِ ثانی کرائی اور اس کی خاطر خواہ تعلیم کا بندوبست کیا۔ قومی ورثے کی نگہداشت کے پیشِ نظر ایک مربوط اور فکر انگیز نصاب تیار کرایا اور اس کو نافذ کیا گیا۔ اسلامی علوم کے مطالعہ اور تحقیق کے لیے ادارہ علوم اسلامیہ قائم کیا۔ شعبۂ تاریخ میں ازمنۂ وسطیٰ کی تحقیق و تدوین کے لیے ایک مستقل شعبہ تصنیف و تالیف کھولا۔ قومی زبان کی توسیع و ترقی کے لیے بی اے اور بی ایس سی کی سطح پر لازمی اردو اور ہندی کا مناسب و معتبر نصاب رائج کیا۔ نوجوان طالب علموں کی بہتر مجلسی تربیت کے لیے ان کی انجمن اتحاد (یونیورسٹی یونین) کے قواعد و ضوابط میں ایسی اصلاحات اور اضافے کیے گئے جن سے اس کا کیرکٹر زیادہ سے زیادہ جمہوری اور نمائندہ ہو گیا۔ اس کی خیابان بندی اس طور پر کرائی گئی کہ طلبا اطمینان اور یکسوئی سے مطالعہ کریں یا گلگشت سے لطف اندوز ہوں۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی اسکیم منظور کرائی۔ یونیورسٹی لائبریری بالخصوص مخطوطات کے شعبے کی از سرِ نو تنظیم و توسیع ہوئی اور کتب خانہ کے لیے ایک علیحدہ خوبصورت کشادہ اور مناسب حال عمارت کی تجویز منظور کرائی۔ خواتین کے کالج کے اخراجات کی پوری ذمہ داری اور کفالت یونیورسٹی سے منظور کرائی۔ یہ کالج علی گڑھ کے نامور فرزند شیخ عبداللہ مرحوم کی مجاہدانہ کوشش سے عرصے سے قائم ہے مسلم یونیورسٹی سے ملحق تھا لیکن محدود مالی وسائل کے سبب سے

اپنے توسیعی پروگرام کو پورا کرنے سے معذور تھا۔ بورڈنگ ہاؤس اور ان کے کامن روم کی سرگرمیوں کو زیادہ باقاعدہ بنایا۔ انجینیرنگ کالج، پالی ٹیکنک اور ان کی کارگاہوں (ورکشاپ) کے کاموں کو ترقی دی اور ان میں طلبا کے داخلے کی تعداد میں اضافہ کیا۔ یونیورسٹی ہسپتال اور ہلتھ سروس کے کاموں کو وسیع تر اور منظم تر کیا اور لائق طبی عملہ فراہم کیا جن سے بحیثیت مجموعی طبی سہولتوں میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ طبیہ کالج کے نصاب میں مفید اور دور رس تبدیلیاں کی گئیں اور اس کے انتظام و انصرام کو زیادہ وسیع اور مستحکم بنیادوں پر قائم کیا گیا۔ مجوزہ میڈیکل کالج کے قیام کی اسکیم کے لیے حکومت کی باقاعدہ منظوری اور اعانت حاصل کی۔ امراض چشم کی مخصوص تعلیم اور تحقیقات کے لیے انسٹی ٹیوٹ کھولا۔ یونیورسٹی کے املاک و اراضی کا باضابطہ ریکارڈ تیار کرایا اور ان میں اضافے کیے۔ لائق اساتذہ طالب علموں اور اہل علم کی نہ صرف ذاتی طور پر ہمت افزائی کی بلکہ ان کے کاموں کے لیے کثیر رقمیں حکومت کے علاوہ دوسرے ذرائع سے فراہم کیں۔ ذاتی اثر و اعتبار سے جتنے کثیر عطیات حاصل کیے اس سے پہلے اتنے مختصر عرصے اور کلیتاً بدلے ہوئے حالات میں شاید ہی کبھی جمع کیے گئے ہوں۔ کیمپس کی موجودہ اور آئندہ ضرورتوں کے پیش نظر تفصیلی منصوبہ مرتب کیا گیا جس کا بڑا حصہ ذاکر صاحب کے عہد میں نافذ ہوا اور بقیہ بعد میں پورا کیا گیا۔ لائبریری، آرٹس فیکلٹی، جیالوجی اور فزکس کے نئے معمل، پالی ٹکنک اور انجینیرنگ کالج میں بڑے پیمانے پر ترمیم و توسیع، یونیورسٹی ہسپتال کی عمارت میں اضافہ اور ضروری رد و بدل، یونین کی عمارت کی توسیع وغیرہ جن کی تکمیل بعد میں ہوتی رہی، ان کا نقشہ اور ان کی تعمیر کے لیے ضروری رقم کی منظوری یہ سب ذاکر صاحب ہی کے عہد میں طے پا چکے تھے۔

یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونے کے علاوہ ذاکر صاحب انجمن ترقی اردو اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی صدر تھے۔ انجمن کا دفتر انھی کی ایما سے علی گڑھ منتقل ہوا۔ ان کی رہنمائی میں اس کی نئی تنظیم عمل میں آئی، مالی حیثیت مستحکم ہوئی اور اس کے کاموں کا آغاز ہوا۔ کانفرنس ایک مضمحل ادارہ بن کر رہ گئی تھی۔ ذاکر صاحب نے اس کو سہارا دیا اور فعال و کارآمد بنایا۔ نابینا اسکول کو سرپرستی میں لے کر اس کی بنیادوں کو مضبوط اور اس کے مقاصد کو بارآور کیا، ہونہار اور ضرورت مند

طالب علموں کی امداد اور ہمت افزائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ سرسید ڈے ایک عرصے سے رسمی روایتی انداز سے منایا جاتا تھا۔ ذاکر صاحب نے اس کو اس طرح منانے کی طرح ڈالی جو نہ صرف اس دن کی اہمیت کو واضح اور دلنشین کرے بلکہ علی گڑھ کے فرزندوں میں اس کے ذریعہ شعور ذات اور انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرے۔ یونیورسٹی کی تاریخی عمارتوں اور ان کے کمروں کو ادارے کے شایان شان نہایت نفاست سے مزین کرایا۔

غرض اتنا کچھ ہوا کہ ملک میں علی گڑھ کو نہ صرف ایک مثالی تعلیم گاہ کا درجہ حاصل ہوا بلکہ وہ ایک ایسی تہذیب و شائستگی کا ترجمان بن گیا جو اصلاً اسلامی تھی، مگر اس کے ساتھ ہی دوسری تمام تہذیبوں کی اعلیٰ روایات و اقدار کو انسانیت کا ناقابلِ تقسیم ورثہ تسلیم کرتے ہوئے ہندستان کی تعمیرِ نو میں ایک اہم اور بیش بہا کردار ادا کرنے کی طاقت رکھتی تھی۔ اس طور پر مستقبل میں علی گڑھ ایک ہم آہنگ وسیع المشرب اور مہذب قومی زندگی کے فروغ و استحکام کی علامت و بشارت بن گیا۔ یہ خوش آیند تبدیلی سب کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ تھی لیکن اس کے محرک اور روح رواں ذاکر صاحب تھے۔

علی گڑھ تحریک کا سب سے بڑا مقصد ہندی مسلمانوں کی اعلیٰ ذہنی و اخلاقی تربیت کے لیے ایسے مواقع فراہم کرنے تھے جو ایک طرف ان کو قومی زندگی میں ایک فعال اور ترقی پذیر جماعت کی حیثیت دلانے میں معین ہوں اور دوسری طرف ملک میں اسلامی تہذیب کی بامعنی اور تخلیقی نشو ونما میں مدد دیں۔ اس طور پر ایک بوقلموں متوازن ہندستانی تمدن کے صحت مند ہم آہنگ اور بابرکت ارتقا کے فروغ کا باعث ہوں یہ ادارہ نوجوان نسلوں کی کیسی تربیت کرنا چاہتا تھا اور ان سے کیا توقعات رکھتا تھا، اس کی وضاحت اس ایڈریس میں ملے گی جو اس کی تاسیس کے موقع پر دیا گیا تھا۔

ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کا عہد علی گڑھ تحریک کے اس بنیادی نصب العین کی پیروی و پابندی کا رہا۔

ذاکر صاحب کا نہایت درجہ قابلِ قدر اور تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شدید تباہی اور یکسر مسماری کے ماحول میں تخلیق و تعمیر کے کاموں کا آغاز کیا۔ ان کا یہ عمل اس حدیث شریف کے مطابق تھا جس میں آنحضرت نے فرمایا ہے کہ اگر مجھ کو یہ یقین ہو کہ کل قیامت آنے والی ہے تب بھی میں آج کھجور کا ایک نیا پودا زمین میں نصب کروں گا۔ اس قولِ پاک میں انسانیت کی اس عمل سے مایوس و ملول دلوں کو کیسی اور کتنی تسکین و تقویت نصیب ہوئی اس کا تصور آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بے غرض خدمت کا تصور عام کیا اور یہ بتایا کہ بے لوث خدمت بالآخر تخریبی عناصر پر غالب آتی ہے۔ انھوں نے اچھے اور بڑے کام کو خود اپنا انعام جاننے اور ماننے پر زور دیا اور اسے عزتِ نفس اور اطمینانِ نفس حاصل کرنے کا وسیلہ بتایا۔ تعصب اور تنگ نظری کے مقابلے میں شرافت اور انسانیت پر قائم رہنے کا درس دیا۔ جہالت اور گمراہی کا سب سے موثر علاج تعلیم و تہذیب سے کرنا سکھایا۔ مہذب اور ایماندار رہنے کے لیے کوئی قیمت وصول کرنے کے بجائے قیمت ادا کرنے کی اہمیت جتائی۔ مایوسی کے اندھیرے میں امید اور حوصلے کے دیے کو روشن رکھنے کی ذمہ داری کا احساس دلایا۔ ہندی مسلمانوں کو ہندستانی انسانیت کا جزو لاینفک جان کر ان کی خدمت کو ہندستان کی خدمت اور خیر اندیشی قرار دیا۔ اور ان پر ہندستانی ریاست کی تمام ذمہ داریوں کو اپنانے کی ضرورت کو واضح کیا۔ علی گڑھ کو قوم کی امانت جان کر اس کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے اس کی افادیت اور اہمیت کو ظاہر کیا۔ اس طور پر ہندستان کی غیر مذہبی جمہوریت کی لاج رکھی۔ ذاکر صاحب کی وائس چانسلری کے یہ آٹھ سال علی گڑھ اور ملک دونوں کبھی نہ بھلا سکیں گے۔

ستمبر ۱۹۵۶ء میں جب وائس چانسلری کی میعاد کے پورے ہونے میں تقریباً سوا سال باقی تھا۔ ذاکر صاحب نے علی گڑھ چھوڑنے کا فیصلہ کیا جو انتہائی غیر متوقع تھا۔ سب نے اسے شدت سے

محسوس کیا اور کوشش کی کہ وہ اپنا فیصلہ بدل دیں لیکن وہ کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے۔ یہ انھوں نے کن اسباب پر کیا اس کی وضاحت نہ انھوں نے کی نہ دوسروں کو دریافت کرنے کی جرأت ہوئی۔ قیاس آرائی بہت ہوئی لیکن بیشتر غلط تھی۔ ذاکر صاحب اجتماعی ذمہ داری کا بڑا گہرا احساس رکھتے ہیں۔ ان کی پوری زندگی اس پر گواہ ہے کہ انھوں نے ذاتی خواہش اور نفع کو اجتماعی مفاد و مقاصد پر کبھی ترجیح نہیں دی اس لیے اس بات کا یقین رکھنا چاہیے کہ انھوں نے علی گڑھ چھوڑا ہوگا تو ان کے نزدیک یہ فیصلہ ان کی ذات کے لیے نہیں بلکہ ادارے کے مفاد میں تھا۔ ذاکر صاحب نے کالج چھوڑا تو جامعہ کو سنبھالا۔ پھر وقت آیا تو جامعہ کو چھوڑ کر علی گڑھ کی ذمہ داری قبول کی۔ علی گڑھ سے جانے کے بعد قومی حکومت کی رکنیت اختیار کی۔ قومی خدمت کا مطالبہ جب کبھی اور جہاں کہیں سے ہوا ذاکر صاحب نے قبول کیا۔ ہر ایسے کام کو فرض جانا اور اس کو اس طرح انجام دیا کہ اس کام کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا۔ لیکن جب کبھی یہ محسوس کیا کہ وہ مفوضہ فرائض کے مطالبات کو اس طرح پورا نہیں کر سکتے جس کا وہ متقاضی تھا تو اس سے دست بردار ہو گئے۔

ذاکر صاحب طبعاً ہر شخص کو اپنا سمجھتے ہیں یا اس میں اچھا بننے کی صلاحیت دیکھتے ہیں یا اس کو اچھا بنا لینے کی اپنے میں صلاحیت پاتے ہیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ اصول جتنا اعلیٰ و ارفع ہے سیاست یا انتظامی مصالح کے اعتبار سے اتنا ہی ناقابلِ عمل مضر یا خطرناک ہو سکتا ہے۔ تاریخ ہی سے نہیں روز مرہ کے حالات و حوادث میں بھی ان کی تصدیق ملتی ہے کبھی کبھی وہ ایسے کو بھی اچھا سمجھنے لگتے ہیں جو ناسزا کام کا مرتکب ہونا اپنے مسلک کا تقاضا اور اپنا کارنامہ سمجھتا ہے۔ عام طور پر دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ کسی نا سمجھ یا شریف آدمی سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے اور اس کی خبر کسی مفسد کو مل جائے تو وہ اس راز کو افشا نہ کرنے کے معاوضے میں طرح طرح کے تاوان وصول کرتا ہے اور بدنصیب گناہگار اپنی شہرت اور ناموس بچانے کی خاطر اپنی ہر متاع عزیز قربان کرتا رہتا ہے۔ ذاکر صاحب کے یہاں ایسی ہی نوعیت ہے وہ اپنی نیکنامی کو محفوظ رکھنے کے لیے نہیں اس لیے کہ وہ ہمیشہ سے مسلم اور بے داغ رہی ہے بلکہ اپنے سکون خاطر کو بچانے کے لیے جو ان کو بہت کم میسر آتا ہے، اور جس کے مرتکب یہی اہل غرض ہوتے ہیں ان کے مطالبات پورے کرتے رہتے ہیں بعینہٖ اس بدنصیب کے مانند جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔

مختصر یہ کہ اہلِ غرض ذاکر صاحب سے اپنے سئیات کا انعام پاتے رہتے ہیں اور خود ذاکر صاحب اپنے حسنات کا تاوان ان کو ادا کرتے رہتے ہیں۔ اور جب تک فریقین بفضلہ بقیدِ حیات ہیں، یہ کاروبار یونہی چلتا رہے گا۔ کام کرنے اور شاید کام لینے کا ایک اسٹائل یہ بھی ہے۔ لیکن اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ فتنہ ایک بار راہ پا جائے تو کسی نہ کسی وقت اپنا سر ضرور اٹھائے گا، پھر وہ سب کچھ ہو جائے گا جو جلد یا بدیر ایسے میں ہوا کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نالائق یا فتنہ پرداز کو ذاکر صاحب جتنا جلد پہچان لیتے ہیں دوسرا شاید نہ پہچان سکتا ہو نیز وہ ان عناصر کو جس طرح قابو میں رکھ سکتے ہیں دوسرا نہیں رکھ سکتا۔ لیکن منصب کے دوران ورنہ اس سے کنارہ کش ہونے کے بعد وہ عناصر دخیل جیسا کہ ان کا معمول ہے اپنی پوری تخریبی قوتوں سے ابھرتے ہیں جن کو ذاکر صاحب نے اپنے عہد میں کسی نہ کسی مصلحت کی بنا پر انگیز کیا تھا یا اپنے طور پر قابو میں رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام اقدار اور ادارے منصوبے، مقاصد اور نیک ارادے جن کی حفاظت اور ترقی کی امانت وضمانت ان کے سپرد کی گئی تھی ان کی علیحدگی کے بعد ابتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ذاکر صاحب جرائم کی اصلاح کر سکتے ہیں جرائم پیشہ کا استیصال نہیں کر سکتے۔ اسے اچھے اور بڑے آدمی کی بڑائی بھی کہہ سکتے ہیں اور اس کی معذوری بھی! بہرحال یہ جام وسندان باختن کا معاملہ ہو یا نہیں، اندیشہ ہائے دور دراز کا مسئلہ ضرور ہے۔

ذاکر صاحب میں ایک خاصہ یا خوبی اپنے قبائلی اجداد کی ملتی ہے یعنی صوفیا، فقرا اور اہل اللہ سے ارادت۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہ ان نفوسِ قدسیہ کے کشف و کرامات پر اتنی نظر نہیں رکھتے جتنی ان کے پاکیزہ کردار پر۔ اس سے ان کی اخلاقی و ذہنی در و بست میں توانائی اور نظر میں رفعت و درافت آئی ہے۔ معلم و مرشد کا قران ذاکر صاحب میں آج سے نہیں بہت دنوں سے چلا آرہا ہے۔ لیکن اس قران کو ہر سطح اور ہر موقع پر ملحوظ رکھنا کبھی کبھی فتنہ و فتور کا بھی باعث ہو سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہو کر اور جلوے سے اپنے ساتھیوں میں واپس تشریف لائے تو سامری کی فتنہ پردازی اور گئوسالہ کی گرم گفتاری پر بے اختیار ہو گئے، اور حضرت ہارون پر جن کے سپرد کیمپ کا ڈسپلن کر گئے تھے پیش دستی کر بیٹھے۔ رسالت

پر سر فراز ہونے سے پہلے بھی ایک قبطی کو بنی اسرائیل پر ظلم کرتے دیکھ کر حضرت موسیٰ نے ایک گھونسے سے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ پیغمبروں میں یہ روایت صرف حضرت موسیٰ کے حصے میں آئی۔ اس پر کسی ستم ظریف نے یہ کہا ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار میں صرف ایک پیغمبر پٹھان تھے یعنی حضرت موسیٰ۔ ذاکر صاحب کے سامنے قائم گنج کے ہم وطنوں کی اس طرح کی کتنی روایات تھیں لیکن انھوں نے اپنے وطن، اپنے سرحدی قبائلی اجداد اور حضرت موسیٰ کی روایات، نیز اقبال کے مشہور مقولہ "عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد" کو نظر انداز کر کے حضرت مسیح کے مصلوب ہو جانے کی روایت کو کس طرح ترجیح دی تعجب سے خالی نہیں۔

ایک بات ذہن میں اکثر آئی ہے وہ یہ کہ داستان کوئی لکھے ڈرامہ میرا دیکھا ہوا ہے اور مولانا محمد علی کا فقرہ یاد ہے جو کچھ اس طرح کا تھا: جامعہ ملیہ کو قائم کرنا اور فروغ دینا اتنا مقصود نہیں جتنا ایم اے او کالج کو قبضے میں لینا اور راہ پر لانا منظور ہے۔ لیکن ذاکر صاحب نے کتنی کڑی قربانی دے کر اور آزمائش میں پڑ کر اس کا نقشہ یکسر بدل دیا اور جامعہ کو بجائے خود ایک مستقل مقصد بنا دیا، اور کتنا عظیم الشان مقصد۔ ان کے عہد میں ان کے غیر معمولی ایثار و اثر سے ہندستان میں جامعہ ایک نادر الوجود ادارہ تھا لیکن ذاکر صاحب جامعہ سے علیحدہ ہوئے تو جامعہ بھی شعلۂ مستعجل بن کر رہ گئی۔ علی گڑھ اور جامعہ دونوں کو ذاکر صاحب ملے۔ ایک نے ذاکر صاحب کو پالا پوسا اور پروان چڑھایا! دوسرے کو ذاکر صاحب نے پالا پوسا اور پروان چڑھایا لیکن اگر کسی دیوانے کو یہ کہتے بھی سنا جائے تو فرزانے کیا کہیں گے کہ علی گڑھ سے ٹوٹ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ خانۂ خدا بنی ہو یا نہیں علی گڑھ آج بھی خانۂ خلق اللہ ہے۔

ذاکر صاحب دہلی سے علی گڑھ گئے تو خیال تھا تھوڑے دنوں ان کو آرام و سکون ملے گا جس کی ان کو بڑی ضرورت تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ وہاں پہنچتے ہی حکومت ہند نے ان کو یونسکو کے اجلاس میں جو اسی سال نومبر میں دہلی میں منعقد ہو رہا تھا اپنا نمائندہ مقرر کر دیا۔ اس اجلاس میں یونسکو نے ان کو اپنی مجلس منتظمہ کا رکن منتخب کیا اور اس سلسلے میں انھیں یورپ جانا پڑا۔ اس مجلس کے

دو وقفوں میں ذاکر صاحب علاج کے لیے جرمنی گئے۔ وہیں وزیر اعظم کا پیغام پہنچا کہ بہار کی گورنری پر تقرر کرنا چاہتے ہیں اور وہ ذاکر صاحب کا جواب نفی میں قبول نہ کریں گے۔ جو لوگ ذاکر صاحب کو جانتے ہیں وہ اس کا احساس آسانی سے کر سکتے ہیں کہ ان کا دل اس عہدے کو آسانی سے قبول کر لینے پر مشکل ہی سے آمادہ ہوا ہوگا اور اس قسم کی دعوت محض وزیر اعظم کی طرف سے موصول ہوتی تو بہت ممکن ہے وہ معذرت کی کوئی صورت نکال لیتے لیکن ان کے لیے پنڈت جی کی بات کو ٹالنا ممکن نہ تھا۔ گاندھی جی کے بعد اگر کسی کے منشا کو پورا کرنے میں ان کو دلی خوشی ہوتی تو وہ پنڈت جی تھے۔ ذاکر صاحب آمادہ ہو گئے اور غالباً اپریل ۱۹۵۷ء میں پٹنہ جا کر گورنری کا چارج لے لیا۔ مسلسل پانچ سال تک اس کی ذمہ داریوں سے بطریق احسن عہدہ برآ ہوتے رہے۔ ان کو حکومت اور عوام کا وہ مثالی اعتماد اور تعاون حاصل رہا جسے اہالیان بہار اور حکومت ہند مدتوں تک نہ بھلا سکیں گے۔

گورنر کی آئینی پوزیشن کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ صرف مخصوص حالت میں صدر ہند کے نمائندہ خاص کی حیثیت سے اسے حکومت کے پورے اختیارات حاصل ہوتے ہیں ورنہ عام طور پر ریاستی حکومت کا سارا کام وزیر اعلیٰ اور اس کی کابینہ انجام دیتی ہے۔ اور گورنر محض ایک مشیر کی حیثیت رکھتا ہے جس کے مشورے کی پابندی پر ریاستی حکومت بالکل مجبور نہیں ہوتی۔ یہ صرف ذاکر صاحب کے اعلیٰ ذہن اور اخلاقی صفات کا نتیجہ تھا کہ حکومت ان کے مشورے کی طلبگار ہوتی اور اس پر عمل کرتی۔ اس کے ساتھ لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ راج بھون جو ریاست کی عام زندگی سے الگ تھلگ حکومت کے سب سے بڑے نمائندہ کا ایک سرد اور سنسان مسکن تھا اور صرف سرکاری تقریبات کے موقعوں پر اس بیمار کے منہ پر مضمحل سی رونق آ جاتی تھی ذاکر صاحب کی موجودگی سے ارباب علم و فن، طلبا، شرفا اور ضرورت مندوں کا ماویٰ و ملجا بن گیا۔ گورنمنٹ ہاؤس کی تزئین و آرائش میں ذاکر صاحب نے جو دلچسپی لی اس کا صحت مند اور خوشگوار اثر ہر شخص نے محسوس کیا۔ انھوں نے وہاں کے مقررہ قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی اس خوش اسلوبی سے کی اور کرائی کہ گرانی طبع کا باعث بننے کے بجائے گوارا اور پسندیدہ معلوم ہونے لگیں۔

ذاکر صاحب موقع اور محل کے مناسب حال عمل پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں بیک وقت اثر پذیری اور اثر انداز ہونے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ ان کا غیر معمولی رسا ذہن آسانی سے ان اسرار و رموز کو پا لیتا ہے جو دوسروں کی سمجھ میں مسلسل مشاہدے اور مطالعے سے بھی مشکل آپاتے ہیں۔ ان کی یہ صفت علم و حکمت کے دقائق اور غوامض ہی کی عقدہ کشائی پر قادر نہیں ہے بلکہ زندگی میں نت نئے پیش آنے والے پیچیدہ اور نازک مسائل کے سلجھانے میں بھی کارگر ہوتی ہے۔ بہار میں وہ نہ صرف ایک ہر دلعزیز گورنر تھے بلکہ ریاست کے ایک محترم بزرگ، دانشوروں اور طالبعلموں کے ہمدرد و قدردان، اور حکومت کے معتبر مشیر اور عوام کے خیر خواہ تھے۔ اس زمانے میں بہار کے جن لوگوں سے ملنا ہوا وہ ذاکر صاحب کی گورنری کو ریاست کے لیے باعث امتنان و افتخار سمجھتے تھے۔

۱۹۶۲ء کے انتخابات کے بعد جب نئی مرکزی حکومت بنی تو ذاکر صاحب کو نائب صدر منتخب کیا گیا۔ ہندوستان کے نائب صدر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے جو خدمات انجام دیں ان سے ملک کا ہر چھوٹا بڑا واقف ہے۔ لیکن حکومت کا ایک عالی مقام عہدے دار ہونا ذاکر صاحب کے لیے اتنا وجہ امتیاز نہیں جتنا یہ کہ ان کی حیثیت ایک اعلیٰ مدبر اور قائد کی ہے، جو ہماری تہذیب کی بہترین اقدار کا حامل و مبلغ ہندوستانی ریاست کی بنیادی اساس و عقائد کا نگہبان، انصاف انسانیت اور شرافت کا پیکر و پیامبر اور ہندوستان میں عالمگیر انسانیت کے اتحاد و یگانگت کا بے لوث خادم بھی ہے اور اس کا گرانمایہ مخدوم بھی۔ حکومت اور ریاست کا کاروبار جیسا کچھ ہوتا ہے اس سے تھوڑا یا بہت کون نہیں واقف ہے۔ مصلحت کی خاطر کیا کیا نہیں ہوتا اور جو اس کام میں پڑتا ہے اس کو کیا کچھ کرنا سہنا یا سہنا نہیں ہوتا۔ ذاکر صاحب کے حصے میں یہ سب آیا ہو تو کیا عجب۔ لیکن ملک کے سنجیدہ طبقے کو اس کا یقین ہے کہ ذاکر صاحب با اصول اور صالح سیاست کے راستے سے کسی حال میں تجاوز نہ کریں گے۔ اور حکومت و ریاست کے کاموں میں ہمیشہ انصاف پسندی اور روشن خیالی سے کام لیں گے۔ ذاکر صاحب کا نہ صرف یہ عقیدہ ہے بلکہ عمل بھی ہے کہ اعلیٰ مقاصد صرف اعلیٰ وسیلوں سے حاصل ہوتے ہیں اور اعلیٰ مقاصد ادنیٰ وسیلوں کے استعمال کا کبھی جواز نہیں بن سکتے۔ حکومت کے فیصلوں کے خوب و زشت کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں، لیکن

ذاکر صاحب اپنا فریضہ پورا کرنے میں حتی الوسع کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ اس کا اعتراف ان کے سارے ہم وطن کرتے ہیں۔ خواہ وہ کسی مسلک و مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔

ذاکر صاحب کے لیے نئی اور نادر چیزوں میں بڑی کشش ہے چاہے وہ چیزیں اتنی مختلف ہوں جتنا گلاب کا پھول یا جیالوجی کا کوئی اعجوبہ، نئی چال کی تصویر اور مصوری ہو یا پرانے زمانے کا کوئی مخطوطہ، "شریعت طریقت تصوف کلام" پر کوئی قدیم تصنیف ہو یا مغرب کے جدید ترین ناول او افسانے "یہ اپنا بیان حسن طبیعت نہیں" اظہار واقعہ ہے۔ ذاکر صاحب گھر پر ہوں گے تو ان سے چند ہی گز کے فاصلے پر یہ ساری چیزیں اپنی اپنی جگہ پر رونق افروز ملیں گی۔ کوئی صاحب فن ہو اس سے گفتگو اس سطح سے کریں گے جو فن اور فنکار دونوں کے حسب حال ہو۔ ایسے میں بعض فنکاروں نے کچھ اس طرح بھی محسوس کیا ہے جیسے ذاکر صاحب کے سامنے عرض ہنر کرنے میں محتاط رہنا فن سے مقدم یعنی فرزانگی ہے۔ ذاکر صاحب کے فکر کی تازہ کاری اور تخیل و ذوق کی رنگا رنگی ان کی شخصیت اور صلاحیتوں کو کبھی باسی یا دور از کار اور ان کی نفع رسانیوں کو کبھی کم نہ کریں گی، جس طرح فطرت کی تازہ کاری رنگارنگی اور نفع رسانی میں آج تک نہ کوئی فرق آیا نہ آئے گا۔ زندگی اسی کا نام ہے جس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے "ہر دم جواں ہے زندگی" یہ صلاحیتیں زیادہ تر فطری ہوتی ہیں لیکن اس میں اس تربیت کو بھی بڑا دخل ہے جو فرد کو اپنی تاریخ و تہذیب کی اعلیٰ روایات صحت مند پُر آزمائش ماحول اور محترم بزرگوں اور ممتاز ساتھیوں سے میسر آتی ہیں۔ ایم اے او کالج کی تعلیم و تربیت کے یہی وہ عوامل تھے جن کے کسر و انکسار میں ذاکر صاحب کی شخصیت بالیدہ ہوئی اور برگ و بار لائی اور کیسے عجیب اور عظیم عوامل تھے وہ، "گوئی فسردہ اند بجام آفتاب را" بقول غالب۔

علم مذہب اخلاق اور انسان دوستی کے پیرو پیکر کبھی اپنی افادیت و اہمیت نہیں کھوتے اس لیے کہ وہ اقدار عظیمہ کے امین و حامل ہوتے ہیں وہ جتنے معمر اور نحیف ہوتے جاتے ہیں ان کا فیض اور فضیلتیں اتنی ہی زیادہ وسیع، موثر اور مستحکم ہوتی جاتی ہیں۔ برخلاف سیاسی لیڈروں یا سرکاری

نیم سرکاری عمال یا عہدہ داروں کے جو باعتبار منصب و عہدہ کتنے ہی اثر و اقتدار کے مالک کیوں نہ ہو جائیں ان سے سبکدوش یا محروم ہوتے ہی اتنے کس مپرس و نامراد ہو جاتے ہیں جیسے وہ اپنے دورِ منزلت کے گناہوں کی سزا بھگت رہے ہوں۔ ایسی عبرتناک مثالیں ہر شخص ہر روز ہر جگہ دیکھ سکتا ہے۔ جن اعلیٰ صفات اور خدمات کی بنا پر ذاکر صاحب نے عام دلوں میں عزت و محبت کی جگہ پیدا کرلی ہے وہ ہمیشہ ترقی کرتی رہے گی خواہ وہ سیاسی یا ملکی عہدہ پر متمکن رہیں یا نہ رہیں۔ وہ گورنر اور صدر کے مناصب پر فائز نہ ہوئے ہوتے جب بھی ان کے مرتبے میں کوئی فرق نہ آتا۔ بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ان عہدوں کی سربراہی ان کو سونپی نہ گئی ہوتی تو کیا عجب وہ عوام اور خواص میں اور زیادہ مقبول و محترم ہو جاتے۔ ذاکر صاحب کی منزلت کا مدار مناصب جلیلہ پر نہیں بلکہ اخلاق فاضلہ پر رہا ہے۔ اور اخلاق فاضلہ میں ذوق و ذہانت اور علم و دانش کا اضافہ ہو جائے تو شخص اور شخصیت کی گرانمائگی لازوال ہو جاتی ہے۔

ذاکر صاحب کا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ بہت وسیع اور متنوع ہے۔ انھوں نے کثرت سے سفر کیے ہیں ہر سطح پر ہر طرح کے ذہنوں سے گوناگوں مسائل پر گفت و شنید کے مواقع آئے ہوں گے۔ ان کو افہام و تفہیم سے ہموار کرنے میں ذاکر صاحب کی کتنی اور کیسی کیسی اعلیٰ ذہنی اور اخلاقی صلاحیتیں بروئے کار آئی ہوں گی، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو ایسے مواقع پر ان سے بہت قریب یا ان کی زندگی کی سرگذشت سے واقف ہوں گے۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کا لحاظ رکھنے میں ذاکر صاحب بڑی انصاف پسندی اور ہمدردی سے کام لیتے ہیں۔ اس اصول یا عقیدہ پر کاربند ہونا آسان نہیں اس لیے کہ اس میں دوسرے کے حق بجانب ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ سیاست اور ڈپلومیسی کی دنیا میں ایسے حق شناس اور عالی ظرف کم ملیں گے، جو اس خطرے کا سامنا کر سکیں۔ تنازعے کے تصفیہ کے لیے ایسا فارمولا دریافت کر لینا جس پر زیادہ سے زیادہ اتفاق اور کم سے کم اختلاف ہو ذاکر صاحب کا ایسا ہنر ہے جس میں ان کا ہمسر مشکل سے ملے گا۔

اس کی مثالیں اس زمانے میں دیکھنے میں آئیں جب وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔

کانفرنسوں کونسلوں اور کمیٹیوں میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا موقع آیا ہو گا جب اتفاق آرا کے بجائے کثرت آرا سے متنازعہ فیہ مسئلہ کا تصفیہ ہوا ہو۔ طریق کار بالعموم یہ ہوتا کہ زیر بحث مسئلے پر ہر شخص کو آزادی تھی کہ وہ اپنا نقطہ نظر بہ نہایت اطمینان و شرح و بسط سے پیش کرے۔ صدر کی حیثیت سے ذاکر صاحب بھی اس میں حصہ لیتے۔ گفتگو کے بعد ذاکر صاحب اپنی تجویز پیش کرتے اور وہ ایسی جامع و مانع ہوتی کہ تمام ممبر اس پر متفق ہو جاتے اور یہ محسوس کرتے کہ زیر بحث مسئلے کا بحیثیت مجموعی وہی تصفیہ مناسب حال تھا جو ذاکر صاحب نے کیا تھا۔ اکثر ایسا معلوم ہوتا جیسے تنازعہ اور اس کا تصفیہ دونوں بیک وقت ان کے سامنے گئے ہوں۔ اس کا سب سے اچھا اثر یہ ہوتا کہ میٹنگ کے بعد کسی ممبر کے ذہن میں اپنے ساتھیوں کے خلاف کوئی کاوش یا کدورت نہ پیدا ہوتی نہ باقی رہتی۔ اعلیٰ تعلیم گاہوں میں یہ روایت اور فضا کتنی مفید اور مبارک ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ اس صورت حال سے ہو سکتا ہے جو عام طور پر آج کل چھوٹے بڑے اداروں میں نظر آتی ہے اور ملک کی بڑائی اور بھلائی چاہنے والوں کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ ذاکر صاحب کے عہد میں اور انہی کی رہنمائی میں طلبا کی مجلس اتحاد (یونیورسٹی یونین کلب) کے قواعد و ضوابط میں بڑی وسعت نظر سے ایسی اصلاح و اضافے کیے گئے کہ خود طلبہ ان سے زیادہ حقوق آزادی کے طلبگار نہیں ہوئے۔ کہا تو یہاں تک جاتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کی یونین کو جتنے جمہوری حقوق ملے ہوئے ہیں کسی دوسری یونیورسٹی کی یونین کو نصیب نہیں ہیں۔ اسے ذاکر صاحب کا فیض کہیے یا طلبا کا احساس ذمہ داری و فرض شناسی کہ ان کی وائس چانسلر شپ کے زمانے میں طلبا نے یونین کے راستے سے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جو ان کے اور اس ادارے کی بہترین توقعات اور روایات کے شایان شان نہ ہوتا۔

ذاکر صاحب کے اردگرد ہر طرح کی مخلوق مل سکتی ہے سوائے اس نسل کے جسے عرف عام میں مصاحب یا درباری کہتے ہیں۔ پہلے کبھی کسی رئیس اور ریاست کا مرتبہ اس پیمانے سے ناپتے تھے کہ اس پر کتنا قرض ہے اور اس کے گرد کتنے مصاحب ہیں۔ رئیس اور ریاست تو اپنی شامت اعمال سے ختم ہو گئے لیکن ہماری شامت اعمال سے ان کے آثار یا روایات باقی ہیں۔ اس فرق کے

سانحہ کہ قرض حکومت کے اور مصاحب نیتاؤں کے حصے میں آئے۔ ذاکر صاحب کو اچھے لوگوں میں بیٹھ کر اچھی باتیں کرنے کا بڑا شوق اور سلیقہ ہے بالخصوص طلبا اساتذہ اور ارباب فن وکمال سے۔ ایسے میں ان کا انداز حاکمانہ ہوتا ہے نہ مربیانہ، بلکہ نہایت درجہ احترام و دلنوازی کا۔ اپنی شان کے مطابق بات کرنا سب کو آتا ہے، بالخصوص جب وہ شان مشتبہ ہو لیکن دوسروں کے نازک شریفانہ احساس اور اس کی ذہنی و اخلاقی سطح کو ملحوظ رکھ کر اس طرح گفتگو یا پرسشِ احوال کرنا کہ مخاطب کی تشفی ہو اور اسے اچھے سے اچھے کام کرنے کی ترغیب ملے، ذاکر صاحب کی سلامتِ طبع، دلسوزی اور دانشمندی کی نمایاں دلیل ہے۔ البتہ وہ اس کو اچھا نہیں سمجھتے کہ آدمی کی جو مخصوص ذمہ داری اور فرائض ہوں وہ ان سے مختلف فرد تر مسائل پر گفتگو کرے اور اس میں اعانت کا خواستگار یا داد پانے کا متمنی ہو لیکن اس اچھا سمجھنے یا نہ سمجھنے کی اہمیت اکثر باقی نہیں رہتی جب گدائے مُبرم جن کی بے شمار اقسام ہیں اپنے مطالبے کو ان سے منوا کر رہتا ہے۔

ذاکر صاحب کا یہ عمل اکثر ایک فارمولے کی بنا پر ہوتا ہے جس کا قصہ انھوں نے ایک بار بڑے لطف سے سنایا تھا۔ ذاکر صاحب جامعہ کے ابتدائی دور میں قرولباغ میں مقیم تھے۔ ان کی اور ان کے رفقا کی زندگی جس "پیغمبری وقت" سے گذر رہی تھی وہ سب جانتے ہیں۔ ایک دن کوئی مولوی صاحب تشریف لائے اور ذاکر صاحب سے تا دیر ان تمام امور پر گفتگو کرتے رہے، جن کا ہر غیر مسلم کو مشرف باسلام ہوتے وقت اقرار کرنا اور ایمان لانا پڑتا ہے۔ ذاکر صاحب نے ان مواعظ کو اسی احترام و عقیدت سے سنا جیسے اس طرح سننا بھی ایمان کا جزو لازم ہو۔ لیکن جب مولوی صاحب نے عقائد میں ایک عمل کا اضافہ کیا یعنی کچھ روپے مانگے تو ذاکر صاحب کی سنجیدگی سراسیگی میں منتقل ہونے لگی۔ مولوی صاحب نے اسے بھانپ لیا اور بڑی نرمی اور نوازش سے فرمایا "میں جانتا ہوں زمانہ سازگار نہیں، زندگی پائدار نہیں، مجھے ایسی فرمائش نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن اب جب کہ کر چکا تو اس کو پورا کرنا لازم آتا ہے۔ مولوی صاحب کا مطالبہ کسی نہ کسی طرح پورا کیا گیا۔ یہ فارمولا تفریح بھی ہے ٹریجڈی بھی اور ذاکر صاحب ہی جانتے ہوں گے کہ کب اور کہاں تک یہ تفریح ہے اور کہاں پہنچ کر یہ ٹریجڈی بن جاتا ہے۔

ذاکر صاحب کی آب و ہوا، ہیں مصاحب اور درباری پنپ نہیں سکتے۔ جب تک وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے کسی بھلے آدمی کو اس کی شکایت نہیں ہوئی کہ ذاکر صاحب کے گرد ایسے مختلف الاوضاع اور اتنے کثیر المقاصد منصوبے کے اشخاص جمع رہتے ہیں یا ایسے موانع ہوتے ہیں کہ عرض حال کا نہ موقع ملتا ہے نہ اس کی ہمت ہوتی ہے۔ درباری یا مصاحب دور دور تک نظر نہ آتے۔ سبب یہ تھا کہ طالب علم ہوں یا اراکین اسٹاف، ذاکر صاحب ان سے جس شفقت و عزت سے پیش آتے اسی شوق سے یہ بھی ضرور دریافت کرتے کہ اس نے مطالعہ کے لیے کیا مضامین انتخاب کیے ہیں کیا پڑھا ہے اور کس ڈھنگ سے پڑھا ہے فلاں کتاب یا مصنف کے مطالعہ کا موقع ملا ہے یا نہیں۔ اسی طرح اراکین اسٹاف سے بھی بعنوان شائستہ یہ پوچھتے کہ وہ کیا پڑھاتا ہے، کیا کتابیں کن مصنفین کی مطالعہ میں رہتی ہیں، نصاب کیا ہے، کیا ہونا چاہیے، شعبہ کی ترقی کی کیا اسکیم پیش نظر ہے کیا مضامین لکھے اور شائع کیے، طلبا اور شعبہ کے رفقاے کار سے کتنا اور کیسا ربط ہے اور اسی طرح کی دوسری باتیں۔ آرٹ ہو یا سائنس، انجینیرنگ ہو یا ڈاکٹری، اسپورٹس ہوں یا صحت و صفائی کے منصوبے، امورِ دین ہوں یا مسائل مملکت' ان سب پر ذاکر صاحب کی نظر حیرت انگیز حد تک جامع و معتبر ہے۔ اس لیے اصحاب متعلقہ ان پر تبادلہ خیالات کرنے کے مواقع یا مواخذے سے حتی الوسع بچنے کی کوشش کرتے تا وقتیکہ ان کو ان مسائل پر عبور نہ ہوتا اور ان کی خدمات بحیثیت مجموعی قابل اعتنا نہ ہوتیں اور یہ وہ موانع تھے جو درباریوں اور مصاحبوں کے لیے ناسازگار اور ناقابل تسخیر تھے۔ پھر بھی یہ اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ زمین کتنی ہی سنگلاخ کیوں نہ ہو شعراے کرام اشعار نکال ہی لیتے تھے۔

عام طور پر منفی خوبیاں قابل لحاظ نہیں ہوتیں مثلاً یہ کہنا کہ فلاں شخص آبرو باختہ بر خود غلط ابن الوقت بد باطن جھوٹا بد چلن یا ہرزہ سرا نہیں ہے تو یہ اس شخص کی کوئی تعریف نہیں اس لیے کہ یہ عیوب عام طور پر شریف لکھے پڑھے آدمی میں یوں بھی نہیں ہوتے نہ ہونے چاہییں لیکن جب بدحالی بدنظمی اور بے غیرتی عام ہو اور اخلاقی بندشیں تیزی سے ٹوٹ رہی ہوں اس وقت سلبی صفات ایجابی خوبیوں کی ہم سطح ہو جاتی ہیں اس لیے کہ ایجابی صفات تقریباً معدوم ہو چکی ہوتی ہیں ذاکر صاحب

کی طالب علمی سے آج تک کی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو کوئی پہلو مجہول یا مبہم نظر نہیں آتا۔ انھوں نے کبھی کوئی بات اضطراراً یا تفریحاً ایسی نہیں کی جو شرافت و شائستگی کے آئین کے خلاف ہو۔ کسی موقع پر اور کسی حال میں کوئی سخیف یا سوقیانہ کلمہ زبان سے نہیں نکالا۔ اپنی کسی برتری کا کبھی لیے سے بھی کبھی اظہار نہیں کیا۔ کسی کی ہتک یا دل آزاری نہیں کی۔ مخالفوں ہی سے نہیں دشمنوں سے بھی تحمل و تواضع سے پیش آئے۔ اپنی بات منوانے کے لیے نہ گلے پر زور دیا نہ زبان کو آلودہ کیا بلکہ سنجیدگی اور مساوات کی فضا کو ہر طرح سے برقرار رکھا۔ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں وہ جس ہمدردی وسیع النظری اور دانشمندی سے کام لیتے ہیں وہ ان کی اعلیٰ ذہنی و اخلاقی قابلیت کا ثبوت ہے۔ آدمیوں کے جنگل میں وہ چند ہی ایسے افراد میں ہیں جو احساس کمتری سے مغلوب ہو کر احساس برتری کی نمایش طرح طرح کی خفیف الحرکتی سے نہیں کرتے۔ ذاکر صاحب ہمیشہ اور ہر حال میں ہر شخص سے خوش ہو کر عزت و محبت سے ملتے ہیں۔ ملنے والے سے کبھی نہ اکتائیں گے۔ کسی بدنصیب کی آبرو ریزی میں دلچسپی لینا درکنار اس خیال کو بھی ذہن میں نہ آنے دیں گے بلکہ اس کی ہر طرح سے پردہ پوشی کریں گے۔ انھوں نے کبھی احسان نہیں جتایا۔ بظاہر یہ بڑی معمولی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ بڑے ظرف و ضبط کا کام ہے جیسے جذبات غضبیہ و شہوانیہ کو قابو میں رکھنا۔ پوشاک ہمیشہ ویسی کپڑے کی سادہ سبحل ستھری بیشتر سفید پہنی۔ ان کے جسم پر کسی نے کاواک ملگجا بوسیدہ یا داغدار لباس نہیں دیکھا۔ مہمان کی تواضع و تکریم میں وہ بدوی فیاضی و فخر سے کام لیتے ہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کو تحائف دینے اور ان کے لیے پھل اور مٹھائی وغیرہ خریدنے میں روپے کا نہیں صرف اپنے حوصلے اور عزیزوں دوستوں سے محبت اور ان کے احترام کا خیال رکھتے ہیں۔ اور یہ باتیں اس وقت سے ہیں جب وہ نہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے نہ بہار کے گورنر نہ جمہوریہ ہند کے نائب صدر بلکہ صرف ذاکر صاحب تھے اور آمدنی کے وسائل بہت محدود تھے۔

ذاکر صاحب کو تحریر اور تقریر پر حیرت انگیز قدرت حاصل ہے۔ ان کے خطبات تراجم اور مضامین ہمارے علم و ادب میں قیمتی اور مستقل اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کہانیاں اور ڈرامے لکھے ہیں جو شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ذاکر صاحب کا منفرد اسلوب ہے۔

ان کا متوازن متجسس شائستہ شفاف وشگوفہ ذہن، پاکیزہ شریفانہ اور نازک احساس، شگفتہ ادبی ذوق، بیدار و تربیت یافتہ شعور، وسیع و متنوع مشاہدہ علم اور تجربہ، انسانیت سے عشق اور خدائے واحد پر ایمان ان کی تحریر و تقریر کو غیر معمولی کشش قوت حُسن اور تاثیر بخشتے ہیں۔ ذاکر صاحب حتی الوسع تحریر و تقریر سے بچتے ہیں اس لیے کہ ان کاموں کے لیے جتنا وقت یا فرصت درکار ہوتی ہے وہ ان کو بہت کم میسّر آتی ہے۔ ایسے مشاغل کے لیے وہ اسی وقت آمادہ ہوتے ہیں جب گریز کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ کام سخت ذہنی اور جذباتی فشار میں انجام پاتا ہے۔ وہ اصلاً تکمیل پسند ہیں اس لیے خود اپنے کاموں سے بہت کم مطمئن ہوتے ہیں بڑے ذہن کا احساس اکثر یہی ہوتا ہے۔ انھوں نے جو کچھ اور جتنا کچھ لکھ دیا ہے وہ اپنے موضوع پر اجتہاد و استناد کا درجہ رکھتا ہے۔ سادگی اعتقاد اور جوش جو اچھی ادبی تحریر کی اہم خصوصیات بتائی جاتی ہیں ذاکر صاحب کی تحریر و تقریر میں ان کا بڑا اچھا اظہار و امتزاج ملتا ہے۔ وہ حشو و زوائد سے یکسر پاک ہوتی ہیں اور پڑھنے اور سننے والے کو ہمیشہ ایک نئے خیال انگیز اور قیمتی تجربے سے آشنا کرتی ہیں۔ جس سے تعمیری و تخلیقی فکر و عمل کی کتنی راہیں کھلتی اور روشن ہوتی ہیں۔ کتنے مختلف النوع مواقع اور مشکل نازک اور خصوصی موضوعات پر کس کثرت سے ذاکر صاحب کو تقریر کرنی پڑتی ہے لیکن ہمیشہ ایسا معلوم ہوا کہ انھوں نے نئی اور وقیع بات کہی۔ یہ فن اور فیض کم کسی کے نصیب میں آیا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ اب کس کو وہ ندا کی آواز پر وہ کدھر اور کہاں جاتے ہیں۔ سعدی کا دیدہ و دل بہر حال ان کے ہمراہ اور جگر کا یہ شعر زبان پر رہے گا:

نیتِ شب بخیر اے ساقی
بزمِ جم کیا ہے ساغرِ جم کیا!

ڈاکٹر ذاکر حسین

ڈاکٹر ذاکر حسین

بد نصیب ملک کی بد نصیب سیاست

خدا کے لئے اس ملک کی سیاست کو سدھاریے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی طرح ڈالیے جس میں قوم قوم پر بھروسہ کر سکے کمزوروں کو زور آور کا ڈر نہ ہو۔ غریب امیر کی ٹھوکرے بچارے جس میں تمدن تمدن امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھول پھل سکیں اور ایک سے دوسرے کی خوبیاں اجاگر ہوں جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو اپنے سماج کا چاکر جانے میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا کہہ دینا سہل ہے۔ اور کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ میں اتنی ہے جتنی کہ پہلے کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کر کچھ سمجھا کر کچھ مان کر کچھ منوا کر ایسی ریاست کی نیو رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہم تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابلِ رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں کب تک شبہ اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم

کو دم گھوٹ گھوٹ کر سکتے دیکھیں کب تک ہم اس ڈر سے تھراتے رہیں
کہ ہماری عمر بھر کی محنت اور عمر بھر کی محبت کو کوئی ایک سیاسی حماقت
کوئی ایک سیاسی ضد بھسم کر دے گی۔ ہمارا کام بھی کوئی پھولوں کی سیج تو
ہے نہیں؛ اس میں بہت مایوسیاں ہوتی ہیں اور اکثر دل ٹوٹتا ہے، پھر
جب ہمارے قدم ڈگمگائیں تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈیں؟ کیا اِسی
سماج میں جس میں بھائی بھائی یکدل نظر نہیں آتے کوئی قدر آخری قدر
نہیں معلوم ہوتی جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں کوئی تہوار
نہیں جو سب مل کر منائیں۔ کوئی شادی نہیں جسے سب مل کر رچائیں
کوئی دکھ نہیں جسے سب بٹائیں ہماری یہ مشکل دور کیجئے اب بھی بہت
دیر ہو چکی ہے۔ اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے۔

نئے آدم کی تلاش

جب ذات پات، مذہب، زبانوں کے فرق سے ہمارا دیس
ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا ہے۔ جس ملک میں اسٹیشنوں پر مسلمان پانی اور
ہندو دودھ ملتا ہے، جس دیس میں مختلف قسم کی نسلیں بستی ہیں جہاں
بالکل مختلف انداز کے تمدن ساتھ ساتھ رائج ہیں جہاں ایک کا سچ
دوسرے کا جھوٹ ہے جہاں بت پرست اور بت شکن کو قدرت نے
ساتھ ساتھ دکھ سکھ کے لئے ساتھ جینے اور ساتھ مرنے کے لئے یکجا کر رکھا
ہے اس ملک میں نوجوانوں سے ایسے مل کر کام کرنے کی آس ذرا مشکل
ہے مگر دل گواہی دیتا ہے کہ تھوڑے دن اور دھکے کھانے کے بعد اس
ملک کے نوجوان دیس کی سیوا کے لئے یکدل ہو جائیں گے اس لئے

میرا عقیدہ ہے کہ ہندستان کی قسمت میں قدرت نے یہ بات رکھی ہے کہ
یہاں مختلف قسم کے انسانی نمونے ایک دوسرے سے مل کر ایک ایسا
آدم تیار کریں جو تہذیب اور تمدن کی ایک نئی تشکیل کر سکے۔ قدرت کے
اس تجربہ اور قدرت کے اس ارادے میں مدد کرنا تمہارا کام ہے!!

ہندستان اور مسلمان

آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کردوں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے۔ اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں تنگ نظری اور دلیس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کرسکنے کو دخل ہے وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے۔ اور مسلمان کسی حال میں بھی یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں سچے ہندستانی کی حیثیت سے بھی اس بات پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کے ادا کرنے پر تیار نہیں اس لئے کہ مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا۔ سو ہوگا ہی۔ خود ہندستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔

گرچہ مثل غنچہ دل گیریم ما گلستان میرو اگر میریم ما

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندستان میں اپنی مذہبی روایات، اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات، اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملی وجود کو خود اپنے لئے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندستانی قومیت کے لئے نہایت بیش قیمت جانتے ہیں اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کئے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں ہندستانی قوم کے ساتھ بھی خیانت سمجھتے ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کو اپنا دیس کسی سے کم عزیز نہیں ہے۔ وہ ہندستانی قوم کا جزو بننے پر فخر کرتے ہیں۔ مگر وہ ایسا جزو بننا کبھی گوارا نہ کریں گے۔ جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو ان کا حوصلہ ہے کہ اچھے مسلم ہوں اور اچھے ہندی۔ اور نہ کوئی مسلمان انھیں ہندی ہونے پر شرمائے اور نہ کوئی ہندی ان کے مسلمان ہونے پر انگلی اٹھائے ہندستان میں ان کا دین ملک سے بے تعلقی کا عذر نہ ہو، بلکہ خدمت کی ذمہ داری ان پر ڈالے اور وہ ان کے لئے عیب نہ ہو بلکہ امتیاز!

ہندستانی مسلمان

میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کا مقام ہندی قوم میں آج ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان آبادیاں دنیا میں بہت ہیں کہیں خدا کے فضل سے وہ اپنی زندگی کی تشکیل میں خود مختار ہیں، کہیں دوسروں کے زیر اقتدار آزادی سے محروم۔ مسلمانانِ ہند کی پوزیشن یہ ہے کہ وہ کسی کے زیر اقتدار نہیں، لیکن تنہا اقتدار بھی نہیں رکھتے ہیں۔ جس کی آبادی مختلف مذاہب مسالک، مختلف السنہ اور مختلف تاریخی و تمدنی عناصر پر مشتمل ہے اسلام کی جو حیثیت عالمی زندگی میں ہونی چاہیے۔ مسلمانوں کی وہی ہندستانی زندگی میں ہے۔ جس طرح دنیا میں مسلمانوں کو اپنے مختلف اعمال و اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اور اپنی مثال اپنے افکار کی بلندی اپنے کردار کی خوبی سے ایک صالح اور صحت مند زندگی کا نمونہ دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہے اسی طرح مسلمانانِ ہند پر یہ ذمہ داری

عائد ہوتی ہے کہ مشترک اور مختلف العناصر ہندی قوم میں حیات طیبہ اسلامیہ کا ایسا نمونہ پیش کریں جس سے ان کے ہموطنوں کے دل میں ان کے دین کے لئے جگہ پیدا ہو۔

مسلمان

مسلمان ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک خاص جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور اسی کے دنیاوی اور سیاسی مفاد کی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے۔ مسلمان پر ساری دنیا کی ذمہ داریاں بھی ہیں، اپنے ملک کی ذمہ داریاں بھی ہیں مسلمان ہونے کے معنی ہیں ذہنی زندگی کا ایک مطمح نظر رکھنا، اقدار کا کوئی نظام ماننا، اخلاق کے کچھ معیار تسلیم کرنا — پست و بلند، خوب و زشت کے کچھ پیمانے برتنا صالح انفرادی اور صالح اجتماعی زندگی کا کوئی نقشہ، فرد اور جماعت کے ربط کا کچھ تصور ذہن میں رکھنا اور یہ سب محض ذہنی اور فکری تسکین اور توازن کے لئے

نہیں بلکہ زندگی کو بنانے اور سنوارنے کے لئے انفرادی تکمیل اور اجتماعی ترقی کی راہیں متعین کرنے اور ان پر گامزن ہونے کے لئے، منزل کے تعین اور اس کی طرف بڑھنے کی توانائی حاصل کرنے کے لئے۔ شکر ہے کہ آج پھر ہمیں اپنی حقیقت کا کچھ کچھ احساس ہوتا جاتا ہے۔ ہم کچھ سمجھتے جاتے ہیں کہ قومی زندگی کا وہ انفرادی انتشاری تصور ہم نہیں اپنا سکتے جو اس دور انحطاط میں ہم پر مسلط ہو گیا تھا کہ اس سے تو وجود ملت ہی مٹ جانے کا خطرہ ہے۔ ہم پھر اپنی ملی ہستی کی خالص دینی اور اخلاقی اساس کو دیکھنے اور سمجھنے لگے ہیں۔ ہمیں اپنی ملت کے

انسانی اور عالمی فرائض کا بھی کچھ کچھ دھیان پھر آنے لگا ہے اور کانوں اور دلوں تک شہداء علی الناس کے مرتبے اور ذمہ داریوں کی یاد دلانے والی آوازیں اور بار پانے لگی ہیں ہم دین کی خارجی رسمیت کی جگہ اس کی تخلیقی اور تنویری قوت کی طرف بھی آنکھ اٹھانے لگے ہیں جو ساری زندگی پر حاوی ہو کر اسے بامقصد اور بامعنی بناتی اور کل زندگی اور کل کائنات میں ہمیں ہماری حیثیت اور جگہ بتاتی ہے۔ ایک ایسی دنیا جو نسل وطن اور دولت کی تفریقوں سے انسانیت کے لئے جہنم بن گئی ہے پھر ہم سے اس حقیقی عدل و مساوات کی فرماں روائی کا پیام سننے اور اس کا عملی تجربہ دیکھنے کے لئے بیتاب ہے جو ایک اُمی نبیؐ نے دنیا کو سنایا اور دکھایا تھا۔ کیا ملت اسلامی اس تقدیر، اس موقع اور اس ذمہ داری کو دو روٹیوں کے بدلے بیچ دے گی؟

اور اگر آپ اپنی قومی زندگی کی موجودہ پستی پر مطمئن ہیں تو میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ آپ کے ثانوی مدارس سے ہی کیا آپ کا سارا تعلیمی نظام بالکل ٹھیک ہے، اس میں ذرا تبدیلی نہ کیجئے ؛ وہ معاشرت میں اندھی تقلید، مذہب میں کھوکھلی رسمیت، سیاست میں محکومیت پسندی کے پیدا کرنے، علم میں ذوقِ تحقیق سے اور فنون میں ذوقِ تخلیق سے نوجوانوں کو بے بہرہ رکھنے، اور کمزور جسم بے نور دماغ اور بے سوز دل پیدا کرنے کے نہایت کامیاب

سکار خاتے ہیں۔

علی گڈھ

اس کے بنانے میں ہندی مسلمانوں کی بہت کچھ محبت، محنت دولت اور بہت کچھ جوش اور خلوص کام آیا ہے۔ اگر یہ قومی زندگی میں وہ رتبہ حاصل کرلے جس کا میں اور میں سمجھتا ہوں ہر مسلمان آرزومند ہے تو اس ملک میں مسلمانوں کے لئے باشرف اور باعزت شہریت کی ضمانت ہو جائے، کہ جمہوریت میں امتیاز شرف خدمت اور خوبی ہی سے حاصل ہوتا ہے، اور انھیں سے قائم رہتا ہے۔

میرا تو یقین ہے کہ علی گڈھ کو قومی زندگی میں بڑا کام انجام دینا ہے۔ وہ کام ہندستانی تدبر اور ہندستانی تعلیم دونوں کا بنیادی کام ہے۔ یعنی ایک جمہوری ریاست میں ایک متحدہ قوم کی تعمیر کا کام اور اس کی زندگی میں چار کرور مسلمان شہریوں کا حصہ اور مقام کتنا بڑا کام ہے، اور کیسا دل کش کام مختلف تمدنی اور تہذیبی عناصر کو باہم سمو کر ایک متوازن اور ہم آہنگ زندگی کی تعمیر کا کام جس میں ہر جزو دوسرے جزو کی رونق کو چمکائے اور ایک حسین وجمیل کل کی تشکیل میں مدد دے۔ ماضی کے سارے خزانوں کو چاہے کہیں سے آئے ہوں ہر ہندستانی کی مشترک میراث بنا دینا، کہ سب ہمارے ہی گمشدہ لعل ہیں، سب کو ایک مشترک ماضی سے مالا مال کرنا سب کو مستقبل میں ایک جد وجہد کا ولولہ بخشنا، کوئی چھوٹا کام ہے؟ اس عزیز وطن کے ہر مسلمان شہری کے ذہن میں یہ یقین رچا دینا کہ ان کا دین اور ہندستانی زندگی کو صالح بنانے میں ان کا منصب، یہ ان پر ذمہ داری کا ایک اور بوجھ ڈالتے ہیں۔ اور خدمت کا ایک نادر موقع پیش کرتے ہیں یہ بے وفائی یا بے اعتنائی کا بہانا نہیں ہیں۔ کچھ چھوٹا کام ہے یہ؟

علی گڈھ جس طرح کام کرے گا، علی گڈھ جس اسلوب پر سوچے گا۔

علی گڈھ ہندستانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے خدمت کی جو پیشکش

دے سکے گا اس سے متعین ہوگا ہندستانی قومی زندگی میں علی گڈھ کا مقام! اور ہندستان جو سلوک علی گڈھ کے ساتھ کرے گا اس پر بہاں اس پر بڑی حد تک منحصر ہوگی وہ شکل جو ہماری قومی زندگی مستقبل میں اختیار کرے گی۔

بدنصیب وطن کی پکار

عزیزو! تم علم کے اس شہر کاشی سے، یہاں کے اس مشہور ودیاپیٹھ میں اچھے اور لائق استادوں سے تعلیم پاکر اب دنیا میں قدم رکھتے ہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس دنیا میں جو ودیا پیٹھ سے بہت زیادہ سخت اور بے رحم جگہ ہے تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارا حوصلہ ہو کہ تجارت اور کاروبار، بیوپار یا نوکری سے بہت سا دھن دولت کماؤ اور چین سے اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی گزارنے کا سامان کرو۔ اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے ارادوں میں برکت دے۔ مگر مجھے تم سے پھر کچھ بہت کہنا نہیں ہے۔ تم اپنی کامیابی کے لئے راہیں تلاش کر لوگے۔ اگر ٹھیک راستے پر پڑے تو اپنا فائدہ کروگے، اگر غلط پر پڑے تو سزا بھگتو گے، مگر دوسروں کا کچھ بہت نقصان نہ ہوگا۔ لیکن چاہے تم دھن دولت کی فکر ہی میں لگ جاؤ، کم سے کم کاشی ودیاپیٹھ کے نائک ہوکر تم کبھی اپنی قوم کی راہ میں روک نہ بننا اپنی کامیابی کے لئے بہتیرے لوگ قوم کا نقصان کرنے سے بھی نہیں چوکتے تم اس کا دھیان رکھنا کہ کامیابی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ

اپنے فرائض کو ترک کر کے اور اپنی ساری اچھی خواہشوں کو پیروں تلے روند کر ہی اس تک پہنچا جائے۔ جو اپنی غرض کے لئے اتنا اندھا ہو جائے کہ اپنے دیس اور قوم کو نقصان پہنچانے سے کبھی نہ چوکے، وہ آدمی نہیں جانور ہے۔

اور اگر کاشی ودیاپیٹھ میں پڑھے ہونے کی وجہ سے تم اپنی زندگی دیس کی سیوا میں لگانا چاہتے ہو۔ تو مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔

تم جس دیس میں یہاں سے نکل کر جارہے ہو۔ وہ بڑا بدنصیب ملک ہے۔ وہ غلاموں کا ملک ہے۔ جاہلوں کا ملک ہے، بے انصافیوں کا ملک ہے، بے رحمیوں کا ملک، بے ظالمانہ رسموں کا ملک ہے، غافل پجاریوں کا ملک، بے بھائی بھائی میں نفرت کا ملک ہے، بیماریوں کا ملک ہے، سستی موت کا ملک ہے، افلاس اور ناداری کا ملک ہے، بھوک اور مصیبت کا ملک ہے۔ غرض بڑا کم بخت ملک ہے۔ لیکن کیا کیجئے تمہارا اور ہمارا ملک ہے۔ اسی میں جینا ہے اور اسی میں مرنا ہے۔ اس لئے یہ ملک تمہاری ہمتوں کا امتحان، تمہاری قوتوں کے استعمال اور تمہاری محبت کی آزمائش کی جگہ ہے۔

ہمارا استقبل کسان کی ٹوٹی جھونپڑی، کاریگر کی دھویں سے کالی چھت اور دیہاتی مدرسے کے پھونس کے چھپر تلے بن اور بگڑ سکتا ہے۔ سیاسی جھگڑوں کا نفرسوں اور کانگریسیوں میں کل اور پرسوں کے قصوں کا فیصلہ ہو سکتا ہے، لیکن جن جگہوں کا نام میں نے لیا ہے ان میں صدیوں تک کے لئے ہماری قسمت کا فیصلہ ہوگا اور ان جگہوں کا کام صبر چاہتا ہے اور استقلال اس میں تھکن بھی زیادہ ہے اور قدر بھی کم ہوتی ہے۔

جلدی نتیجہ بھی نہیں نکلتا۔ ہاں کوئی دیر تک صبر کر سکے تو ضرور پھل میٹھا ملتا ہے سیوا کے اس راستہ میں جس کا ذکر کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ بڑی دشواریاں ہیں۔ اس لئے ایسے وقت بھی آئیں گے کہ تم تھک کر شل ہوجاؤگے، بے دم سے ہوجاؤگے اور تمہارے دل میں یہ شبہ بھی پیدا ہونے لگے گا کہ یہ جو کچھ کیا سب بے کار تو نہ تھا۔ اس وقت مادی اور امکانی طور پر آزاد بھارت ماتا کی اس تصویر کی طرف ہمیشہ دھیان لگانا جو تمہارے دل میں ہمیشہ رہنی چاہیے۔ یعنی اس دیس کی تصویر جس میں سچائی کی حکومت ہوگی، جس میں سب کے ساتھ انصاف ہوگا، جہاں امیر غریب کا فرق نہ ہوگا۔ بلکہ سب کو اپنی اپنی صلاحیتوں کو پوری پوری ترقی دینے کا موقعہ ملے گا، جس میں لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ کریں گے اور ایک دوسرے کی مدد جس میں مذہب اس کام

میں نہ لایا جائے گا کہ جھوٹی باتیں منوائے اور خود غرضیوں کی آڑ بنے، بلکہ زندگی کو سدھانے اور اس کو بامعنی بنانے کا ذریعہ ہوگا۔ اس تصویر پر نظر ڈالو گے تو تمہاری تھکن دور ہو جائے گی اور تم نئے سرے سے اپنے کام پر لگ جاؤ گے۔ پھر اگر چاروں طرف کمینہ پن اور خود غرضی مکاری اور حیلہ بازی غلامی اور غلامی پر رضامندی پاؤ تو سمجھنا کہ ابھی کام ختم نہیں ہوا ہے، مورچہ سر نہیں ہوا۔ اس لئے جنگ جاری رکھنی چاہئے۔ اور جب وہ وقت آئے جو سب کو آتا ہے، اور اس میدان کو چھوڑنا پڑے تو یہ تسلی تمہارے لئے بس ہوگی کہ تم نے اپنے بس بھر اپنے سماج کو آزاد کرانے اور اچھا بنانے میں کوشش کی جس نے تمہیں آدمی بنایا تھا۔ تم چلے جاؤ گے دوسرے تمہارے کام کو جاری رکھیں گے۔

اس لئے کہ یہ کام کبھی ختم ہونے والا کام نہیں۔ سماج کی آزادی اور سماج کی صحت ایسی چیزیں نہیں جو بس ایک دفعہ حاصل کر لی جائیں یہ اسی سماج کو ملتی ہیں اور اسی کے پاس رہتی ہیں جس کے سپوت انھیں روزانہ نئے سرے سے حاصل کر سکیں۔

کاش!

یوں تو آدمی آنکھوں پر ٹھیکریاں رکھ لے تو کوئی اس کا کیا کر سکتا ہے پر آپ کے چاروں طرف جو دکھ اور بیماری پھیلی ہوئی ہے، افلاس اور فاقے نے صحت کا جو حال کر رکھا ہے، جہل نے جس طرح اس بری حالت کو اور بدتر بنا دیا ہے، اس کا احساس آپ کو ہوگا تو چین کی نیند نہ سو سکیں گے۔ زندگی کی بپتا دکھ اور بیماریاں ہم سے اتنی قریب ہیں کہ اکثر ہم ان سے غافل ہو جاتے ہیں، آہیں اتنے سینوں سے نکلتی ہیں کہ ساری فضا ان سے بھر جاتی ہے، اور ہم انہیں سن نہیں سکتے۔ اور شاید یہ اپنی زندگی گزارنے کے لئے ٹھیک ہی ہو۔ اس لئے کہ اگر احساس قوی ہو، ہر آہ سنائی دے اور ہر دکھ دکھائی دے، تو ایسا ہو جائے جیسے کوئی گھاس کے اُگنے اور بڑھنے کی آہٹ سننے لگے، اور ہر جاندار کے

دل کی دھڑکن محسوس کرنے لگے۔ اور شاید ہم اس ہیبت ناک شور کی تاب نہ لاسکیں جو پیتا کے اس سناٹے میں چھپا ہوا ہے یگر یہ سنائی دے کر جا ہے ہمارے کانوں کے پردے نہ پھاڑے اور دکھائی دے کر ہماری آنکھوں کو رلا رلا کر بے نور نہ کرے مگر اس کے وجود کا علم ہمیں ہے اور اس سے بھاگنا ممکن نہیں میری التجا آپ سے یہ ہے کہ اس دکھ کے دور کرنے کے لئے آپ کمر باندھیں، ہمت سے سب کام ہو جاتے ہیں

ایک اچھی زندگی کا اسوہ حسنہ ہزاروں لاکھوں نہیں کروڑوں انسانوں کے لئے رحمت بن جاتا ہے۔ ایک گندہ خیال، ایک فاسد مگر دل فریب زندگی، مدتوں تک زندگی کے چشموں کو مسموم کرسکتا ہے۔ ایک خود غرضی، ایک ہرٹ، ایک کوتاہ اندیشی لبا دفات قوموں کی قوموں کے لئے زندگی کو عذاب بنا سکتی ہے۔ جس زندگی کا توازن اتنا نازک ہو اس کے مطالبوں سے جامد ذہن عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

میرا پیام آپ کو یہی ہے کہ اپنی سیرت کی تربیت کو اپنے ہاتھ میں لیجئے، ضبطِ نفس اور بے غرض خدمت سے اس کے عناصر کی پرورش کیجئے، اچھی سیرت بنائیے اور اسے اقدار عالیہ مطلقہ کا خادم بنا کر شخصیت اخلاقی یعنی بندۂ مومن اور مرد مجاہد کے مرتبہ بلند پر پہنچائیے کام بڑا دشوار ہے اور عمر بھر کا کام ہے۔ مگر اسی کام کے کرنے کے لئے ہی تو زندگی عطا ہوئی ہے یہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنے سے کیسے انجام پائے گا اس میں تو زندگی ہی کھپانی چاہیئے۔

علی گڈھ کی جامعہ ملیہ

عجب زمانہ تھا وہ صاحبو۔ نشۂ جوانی سے سرمست نوجوانوں پر پہلی بار وہ مخلصانہ دینی کیفیت طاری تھی جس کا ایک لمحہ کبھی کبھی ساری زندگی کا رنگ بدل دیتا ہے یہ جرمانوں کے ڈر سے نمازیں پڑھنے والے راتوں کو روتے اور گڑگڑاتے سنائی دیتے تھے۔۔۔۔ خود غرضیوں کی ہر وقت جکڑے رہنے والی زنجیریں ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ ڈھیلی ہو رہی ہیں ٹوٹ رہی ہیں ملازمتوں کے متلاشی سفارشوں کے لئے سرگرداں۔ اپنے پیٹ کے علاوہ اور سب حقیقتوں سے ناآشنا نوجوان بیتاب تھے کہ اپنے وجود کو وجود ملی میں گم کردیں اور اپنی ساری قوتوں کو اس کی خدمت کے لئے وقف کردیں لیکن عمر بھر خود غرضی کی تکرار سے بے غرض کاموں کی مشق تو نہیں ہوتی۔ اس بے غرضی کا رخ بھی جاذب توجہ ہنگاموں کی طرف گلوں میں جھولیاں ڈال کر نکل کھڑے ہونے کی طرف تقریروں کی طرف نئی نئی وضع کے لباسوں کی طرف ہی جاتا ہے خدا کا شکر ہے کہ چند نوجوانوں کے اصرار پر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے اس وقت اس جوش اور خلوص کو پائیدار کام میں لگانے کا فیصلہ کیا اور مجھے وہ وقت یاد ہے اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی جب علی گڈھ کالج کی مسجد میں ایک وجود مقدس قید، جلا وطنی علالت اور تفکرات ملی نے جس کی ہڈیاں پگھلا دیں تھیں۔ جس کے چہرے کی زردی سے معلوم ہوتا تھا غم کی آنچ نے خون کا ایک ایک قطرہ خشک کر دیا ہے۔ لیکن جس کی روشن آنکھیں اس یقین کی غمازی کر رہی تھیں کہ اگرچہ سب کچھ بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن مردوں کی طرح ہمت کی جائے تو مدد خداوندی سے بہت کچھ بن سکتا ہے۔ یہ وجود مقدس دیوار کا سہارا لئے بیٹھا ہے ناتوانی کے باعث مجمع کو خطاب بھی نہیں کر سکتا۔ اور اس کا پیام اس کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی سناتے ہیں۔ صاحبو! یاد رہے کہ وہ دیوار جس کا سہارا لئے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ، پتھر کی دیوار نہ تھی۔ وہ ایمان محکم اور اس ایمان کے نتیجہ یعنی ایک عظیم الشان ملی ماضی کی دیوار تھی۔ اور وہ صرف نوجوانوں کو مخاطب نہ فرما رہے تھے جو ان کے سامنے تھے، ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔ اس وقت کسی بڑے مکان کا سنگ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا کسی عمارت کا افتتاح نہ ہو سکتا تھا۔ چندوں کا اعلان بھی نہ ہوا تھا کہ یہ قافلہ سروسامان چھوڑ کر بے سروسامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا یہ وقتی

ذاتی فائدوں کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا۔ اسے عاجلہ کے مقابلہ میں آخرہ زیادہ عزیز تھی۔ وہ محنت اور مشقت کا عزم لے کر تعمیر نو کے لیے نکلا تھا اور اس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا۔ یوں اور اس فضا میں جامعہ ملیہ کا کام شروع ہوا تھا، ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو۔

پچیس سال بعد

جامعہ کی پچیسویں سال گرہ۔ کیا کیا خیال۔ کس کس کی یاد۔ کیسی کیسی ہمت شکن تنقیدیں۔ اور کیسی کیسی ہمت افزا حمایتیں۔ بے وفائیوں اور وفاداریوں، کم ہمتی اور استقامت، خاصی کٹھن راہ پر تھک تھک کر تھم جانے اور پھر ایک دوسرے کو سہارا دے کر اس راہ پر قدم بڑھانے کی کتنی تصویریں ذہن کے سامنے گزر جاتی ہیں۔

۲۵ برس! لوگ اکثر کہہ دیتے ہیں کہ قوموں کی زندگی میں ۲۵ برس کیا ہوتے ہیں۔ ہاں سوئی ہوئی قوموں پر صدیاں بھی کسی ناقابل ذکر تصور کے ساتھ گزر جاتی ہیں۔ جن قوموں کو کچھ کرنا ہوتا ہے ان کے لئے پچیس سال بھی بہت ہوتے ہیں۔ پچیس برس میں قومیں اپنی زندگی کا رخ بدل لیتی ہیں، رحمت بن جاتی ہیں، عذاب بن جاتی ہیں.........

۲۵ برس اور اتنا سا کام! ہاں بہت کم کام ہے — بہت معمولی کام ہے۔ بظاہر بہت بے اثر سا کام ہے لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے بڑے کاموں کا بیج ہے۔ جماعتی کاموں میں میرا گمان ہے کہ پہلے سے راہ کے جملہ نشیب و فراز سے آگاہ ہونا اتنا اہم نہیں جتنا کہ ساتھ مل کر چلنے والوں کا یکجا ہونا۔ توفیق الٰہی شامل حال ہو تو یہ راہ بھی دریافت کر لیتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے۔

من از طریق نہ پرسم رفیق می جویم
کہ گفتہ اند نخستیں رفیق و باز طریق

جہاں پچیس مہینے کام کو مل کر کرنے کی مثالیں کمیاب ہوں وہاں پچیس برس آرام و آسائش میں نہیں تکلیف اور بے سروسامانی میں جمے رہنا بالکل بے معنی بات نہیں۔ اس پر بہت فخر کرنے کا موقع بے شک نہیں، اور نہ یہ خیال دل میں لانا چاہیئے کہ اوروں سے کچھ نہ بن پڑا — دوسرے کی کم ہمتی کو اپنے لئے معیار بنانا بڑی ہی کم ہمتی کی بات ہے، پست نظری کی بات ہے لیکن مایوس ہونے کی کوئی بھی وجہ نہیں۔

اردو میری زبان

(۲۷ نومبر کو ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ کے انتظام میں اردو نمائش اور کتب خانہ کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین گورنر بہار نے اس نمائش کی خصوصیات کی طرف اشارہ کیا، اور ادارہ تحقیقات اردو کی خدمات کو سراہا۔ اس کے بعد انھوں نے اردو زبان کے متعلق حسب ذیل خیالات ظاہر کیے۔)

مجھے اس عام خوشی اور افتخار سے کچھ زیادہ خوشی، کچھ زیادہ افتخار اس لیے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ دونوں کام جو اس وقت انجام پا رہے ہیں اردو زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ زبان جو میں نے پہلے پہل اپنی ماں سے سیکھی تھی، جس میں میری ذہنی پرورش ہوئی، جس میں اب تک سوچتا ہوں، جس کے علمی اور ادبی سرمایہ سے اپنی استعداد کے بقدر فیض اٹھایا ہے۔ اور یہی نہیں کہ اس سے مجھے شخصی اور ذاتی لگاؤ ہے بلکہ اس لیے بھی کہ ایک وفادار ہندستانی شہری کی حیثیت سے مجھے یہ زبان اس زندگی کے پھلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کی بشارت دیتی ہے جو ہم سب ہندستانی اپنے آزاد وطن میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس زندگی کی روح کیا ہے؟ اس کی روح ہے اور ہمیشہ سے رہی ہے کثرت میں وحدت کی تلاش،

الگ الگ اور طرح طرح کے عناصر سے ایک ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کے بنانے کی آرزو جو رنگ برنگ کے تمدنی پھولوں کو وحدت قومی کے ڈورے میں پرو کر ایسا ہار بنایا چاہتی ہے کہ وہ ہار گوندھ کر انسانیت کی گردن میں ڈالا جائے تو اس کی شوبھا کو بڑھا دے۔ جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ

"ہے رنگ لالہ و گل نسریں جدا جدا"

یہ کہنے کی ہمت رکھتی ہے کہ

"ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے"

...... جس میں کل اپنے کو جزو کا رقیب نہیں سمجھتا ہے، اس کی طاقت کو اپنا بل جانتا ہے۔ ہندستانی زندگی کے تمدنی مظاہرے میں مجھے یہ روح اردو زبان میں بڑے ستھرے اور نکھرے ہوئے روپ میں دکھائی دیتی ہے اور اردو کی تاریخ پر تحقیقاتی کام مجھے اس وجہ سے اور بھی اہم دکھائی دیتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادنیٰ تامل سے یہ بات بالکل روشن ہو جائے گی کہ اردو نہ کسی فرقے کی زبان، نہ کسی مذہب کی زبان ہے، نہ کسی حکومت کی زبردستی سے چلائی ہوئی زبان ہے، نہ کسی خاص نیت سے مصنوعی گڑھی ہوئی زبان ہے؛ یہ تو جنتا کی بولی ہے —— لوگوں کی زبان ہے۔ آپس کے میل جول کا پھل ہے، میلوں، ٹھیلوں، بازاروں، منڈیوں کی ریل پیل میں بولی ہوئی زبان ہے۔ زندگی کے بیوہار کے کانٹوں میں تلی ہوئی زبان ہے۔ چیزوں کے لین دین کے ساتھ وچاروں کے لین دین کا نتیجہ ہے۔ یہ فقیروں اور سنتوں کی زبان ہے جو اپنے معرفت میں ڈوبے ہوئے دل کی بات اوروں تک پہنچانے کے لئے بیکل تھے اور جن کی من موہنی باتیں سننے کو عام لوگ کان لگائے رہتے تھے؛ اس لئے یہ محبت اور پریم کی زبان ہے، رواداری کی زبان ہے، میل ملاپ کی زبان ہے اس کا دل بھی بڑا ہے۔ اس کی جھولی بھی بڑی ہے۔ یہ نئے انداز سے جھجکتی نہیں، نئی بات پر بدکتی نہیں، لفظوں سے گھنیاتی نہیں، وچاروں سے چھوت چھات نہیں کرتی۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں اردو کے گن خواہ مخواہ گا رہا ہوں، ان کا ذکر اس لئے کرتا

ہوں کہ ہمیں جو سماج بنانا ہے اس میں جوڑنے والی طاقتوں کو ابھارنا ہے، توڑنے والی طاقتوں کو دبانا ہے زبان جوڑنے والی طاقت ہے۔ ہر زبان جوڑتی ہے، پر ہر زبان والے اسے اپنے کو دوسروں سے الگ کرنے کا آڑ بنا لیتے ہیں اس پر لڑتے ہیں، کٹتے مرتے ہیں، ایک دوسرے پر تہمتیں باندھتے ہیں۔ ایک ہی دیس میں ایک زبان والا علاقہ دوسری زبان والے علاقے سے ایسا برتاؤ کرتا ہے جیسے کوئی پرایا دیس ہو یہ سب بڑی بھول کی باتیں ہیں اور آج جب کہ دیس کو اپنی آزاد زندگی کی پہلی کٹھن منزل در پیش ہے، اتحاد قومی ازبس ضروری ہے۔ ان جھگڑوں میں پھنس کر ہم ان مشکلوں کا سامنا کیسے کر سکیں گے جو آگے دکھائی دے رہی ہیں۔ اردو، چونکہ دیس کے کسی ایک علاقے میں محدود نہیں ہے، ہر جگہ ہی اس کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں اس لئے اس کو تو وحدت قومی کے بیدار کرنے میں سب سے آگے ہونا چاہئے۔ لیکن پچھلی تاریخ نے اس میں بھی بہت سے پیچ ڈال دیئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ پردیسی زبان ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ یہ خالی مسلمانوں کی زبان ہے، نہ پردیسی زبان ہے اور اچھا مان لو کہ یہ مسلمانوں ہی کی زبان ہوتی تو بھی تو ہماری آزاد جمہوری زندگی میں یہ کوئی عیب کی بات نہ ہوتی۔ ہر آدمی جو ہمارے دیس میں رہتا ہے، اسے اپنا دیس جانتا ہے اس کی عظمت کو مانتا ہے، اس کے مطابق چلتا ہے، وہ ہمارا بھائی ہے۔ ساتھی ہے۔ دوست ہے۔ اس کی ترقی ہماری ترقی ہے اس کی بھلائی ہماری بھلائی ہے۔ مگر اردو تو خالی مسلمانوں کی زبان ہے بھی نہیں۔ کوئی فہرست نہیں بنائی ہے۔ جو نام اس وقت یاد آگئے وہ لیتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ تربھون ہجر، جوالا پرشاد برق، رتن ناتھ سرشار، پروفیسر رامچندر، سدرشن، کرشن چندر، مہندر سنگھ بیدی۔ برجموہن دتاتریہ نسیم۔ چکبست، سرور جہاں آبادی، فراق گورکھپوری، منشی نول کشور، لالہ سری رام صاحب خمخانہ جاوید، تنویر لالی، منشی دیا نرائن، کی زبان کو کوئی مسلمانوں کی زبان کیسے بتاتا ہے اور اس زبان پر مذہبی تنگدلی اور تنگ نظری کی پرورش کرنا، کون سی دیانت ہے کون سی فراست ہے پھر اردو نہ بدیسیوں کی زبان ہے نہ بدیسی زبان ہے۔ ذرا بھی دیکھئے تو

قدم قدم پر اس کی شہادت ملتی جائے گی۔ لسانی نقطۂ نظر سے اس کے افعال اور
حرف اور عام ضرورت کی باتیں سب ہندی ہیں۔ اس کی آوازوں پر کان
دھریے تو ایران اور عرب سے کوئی رشتہ نہیں ملتا۔ آوازوں کی بہت بڑی
تعداد خالص ہندستانی ہے عربی لفظوں میں جو اجنبی آوازیں آئی ہیں انھیں بھی
بول چال میں اپنا لیا ہے۔ لکھائی میں بھی اس کے پردیسی ہونے پر بہت زور
دیا جاتا ہے۔ درجنوں ہندستانی آوازوں کے ظاہر کرنے کا اس میں سامان
ہے۔ اس میں ڑ، ڈ، ٹ، ڈھ، تھ، بھ، پھ، جھ، چھ اور تھ کیا یہ دیسی آوازوں
کے نشان ہیں؟

دوستو! شاید اس وقت یہاں اردو دوست زیادہ جمع ہوں، آپ سے
یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا فرض ہے کہ اپنی عزیز زبان کی روح کو آپ کسی
حال میں مسخ نہ ہونے دیں۔ کوئی اس روح سے ناواقف ہو تو اسے بتائیں کہ یہ
روح کیا ہے؟ اس روح کو تازگی بخشیں کہ ایک اچھی سماجی زندگی کے بنانے میں
آپ کا ادب کسی اور سے پیچھے نہ رہے۔ زبان اور ادب کا مقابلہ یہ نہیں ہے کہ کسی سے
روٹھ گئے، کسی کو برا سمجھ لیا، کسی کو دبا دیا۔ اس میں جیت اسی کی ہے جو خدمت کے
میدان میں اوروں سے بازی لے جائے۔ مقابلہ اس میں سمجھئے کہ کس زبان کے گیت
قوم کے دل کو گرماتے ہیں، کس کا ادب صالح اقدار کی ترویج کا ذریعہ بنتا ہے۔ کون
اچھے آدمی، اچھی زبان اور اچھے سماج کے بنانے میں؟ اس کو عدل و انصاف صداقت
و امن کی بنیادوں پر مضبوط کرنے میں، غلطی پر جرأت سے روکنے میں، نیکی کو فراخدلی
سے سراہنے میں، دماغوں کو تنگ نظری اور تنگ دلی کے جالوں سے صاف کرنے میں،
علم کی سرحدیں آگے بڑھانے میں، آدمی نے جن سچائیوں کا سراغ لگا لیا ہے،
کہیں لگایا ہو کسی نے لگایا ہو، ان سے اپنے ہم وطنوں کے ذہن کو منور
کرنے میں، جذبۂ قومی کو ایک قومی اور موثر جذبہ بنانے میں، وطن اور اس وطن
کی اچھائیوں اور خوبیوں سے وہ ذہنی وابستگی اور روحانی وابستگی پیدا کرنے میں
جو قومی وفاداری کی جڑ ہے، کون زبان دوسری زبان سے زیادہ کارگر ہے۔ یہ
نیکی کا مقابلہ ہے۔ اس میں جیت اور ہار نہیں ہوتی اس میں مقابلہ کرنے والے
ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں۔ اور دوسرے کو آگے بڑھ جانے پر

بھی اتنا ہی خوش ہوتے ہیں جتنا خود اپنے آگے نکلنے پر۔

میری التجا ہے اور مجھے امید ہے کہ تاریخی اتفاقات نے اردو ہندی کے تعلق میں جو گتھیاں سی ڈال دی ہیں وہ اردو اور ہندی دونوں کے کام کرنے والے مل کر اپنی سوجھ بوجھ اور صاف دلی سے اس طرح سلجھائیں گے کہ یاد بھی نہ رہے گا کہ کبھی یہ الجھن پیدا بھی ہوئی تھی محبت سے کہتے ہیں ٹوٹے ہوئے دل جڑ جاتے ہیں اور ایسے جڑتے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں بال پڑا تھا۔ ؎

دلِ شکستہ در آں کوئے می کنند درست　　　　چناں کہ می نشناسی کہ از کجا بشکست

میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب بھی کہتا ہوں کہ اردو کسی طرح ہندی کی رقیب نہیں ہے۔ سب ہندستانی شہری ان کی زبان کچھ بھی ہو، دستورِ ہند کے مطابق ہندی کو دیس کی سرکاری زبان مانتے ہیں اور اس کی ترقی میں ہاتھ بٹانا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اردو والے بھی اس سے باز نہیں ہیں۔ پھر اردو ہندی کی رقیب کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ بھی ہندستانی دستور کی تسلیم کی ہوئی قومی زبانوں میں سے ایک ہے۔ اور ہندی سے سب سے قریب ہے۔ اس لئے اگر اردو والوں کو کہیں کوئی شکایت ہو کہ ان کی زبان کی ترقی میں کوئی رکاوٹ ہے تو میرا جی چاہتا ہے کہ ان کی طرف سے پیروی ہندی والے کریں اس سے بھروسہ اور محبت کے ایسے سوتے پھوٹیں گے کہ ساری قومی زندگی اس سے سیراب ہوگی۔ سارے دیس میں لسانی سیاست کا رنگ ہی بدل جائے گا۔ ذہنی تعاون کی راہیں کھل جائیں گی۔ آپس کا ربط بڑھے گا تو کیا عجب ہے کہ سارے دیس میں ایسی حسین اور شیریں زبان، ایسی ستند اور مدھر اور کومل بھاشا کا چلن ہو جائے جو بس ہزاروں کی گنتی میں عالموں اور ودوانوں تک محدود نہ ہو بلکہ کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنا سکے۔

ابوالکلام آزاد

ہم مسلمان ہندستان کی تاریخ کا جلی عنوان

جامع مسجد کا تاریخی خطبہ (۱۹۴۷)

عزیزانِ گرامی! آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی زنجیر ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لئے شاہ جہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع نیا نہیں ہے۔ میں نے اس زمانے میں بھی کہ اس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں تمہیں خطاب کیا تھا جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کے بجائے اطمینان تھا اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے یقین ـــ آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند سالوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمہیں یاد ہے کہ میں نے تمہیں پکارا، تم نے میری زبان کاٹ لی میں نے قلم اٹھایا تو تم نے میرے ہاتھ قطع کر دیئے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیئے میں نے کروٹ لینا چاہی تو تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں آج داغِ جدائی دے گئی ہے، اس کے عہدِ شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے

میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج انہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمہیں صراط مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو میں اب ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گذاری ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لئے چن لیا تھا وہاں میرے بال و پر کاٹ لئے گئے۔ یا میرے آشیانے کے لئے جگہ نہیں رہی۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی، کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں اور کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا۔ یہ خوف تم نے خود فراہم کیا ہے۔ یہ تمہارے اپنے اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیاتِ معنوی کے لئے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو چھوڑ دو یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہوا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں لیکن تم نے سنی ان سنی برابر کر دی۔ اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی رفتار تمہارے لئے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں۔ تم نے دیکھ لیا کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں۔ وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت میں مشیت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے یعنی تمہارے نزدیک عام طور سے فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی۔ اور راہنمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کئے تھے وہ بھی دغا دے گئے۔ حالانکہ تم نے یہی سوچا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لئے بچھائی گئی ہے۔ اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔ میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف

پلٹ جاؤ تو تمہارے لئے بہت سی گرہیں کُھل سکتی ہیں۔ ایک وقت تھا میں نے ہندستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا:

"جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ ہندستان کی تقدیر میں بھی سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے۔ اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلوتہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔" آج ہندستان آزاد ہے اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ وہ سامنے لال قلعہ کی دیوار پر آزاد ہندستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے۔ اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شئے چھن گئی اور اس کی جگہ کوئی بُری شے آ گئی یہ واقعہ نہیں واہمہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بری شے چلی گئی اور اچھی شے آگئی۔ ہاں تمہاری بے قراری اس لئے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لئے تیار نہیں کیا تھا۔ اور بری شے ہی کو نجات مادی سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طبع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا جب تم کسی جنگ کے آغاز کی فکر میں تھے۔ اور آج اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پہ کیا کہوں کہ ادھر ابھی سفر کی جستجو ختم ہوئی اور ادھر گمرہی کا خطرہ بھی درپیش آ گیا ہے۔

میں نے تمہیں ہمیشہ کہا اور پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھا لو اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمھارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے نام پر اختیار کی ہے۔ اس پر غور کرو تمہیں محسوس ہوگا کہ یہ غلط ہے اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اپنے دماغ کو سوچنے کی عادت ڈالو۔ اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کو کہاں گم کر دیا؟ ابھی کل کی بات ہے یہیں جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا۔ اور تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو۔ جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمھارا جوش و خروش بے جا تھا اسی طرح آج یہ تمہارا خوف و ہراس بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انھوں نے تمہیں جانے کے لئے ہی اکٹھا کیا تھا آج انھوں نے تمھارے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تو یہ تعجب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمھارے پاس ہیں تو ان کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امیؐ کی معرفت فرمایا:

جو خدا پر ایمان لائے

اور اس پر جم گئے تو ان کے لئے نہ تو کسی کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم۔ ہوائیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا یہ موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی

اس حالت میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں لیکن مجھے تمہاری تغافل پیشگی کے پیش نظر بار بار کہنا پڑتا ہے کہ تیری طاقت اپنے گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا ہے سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے۔ اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمہارا معاملہ بدلا نہیں اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی تو پھر حالت دوسری ہے لیکن اگر واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے تو پھر اس طرح بدلو جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔

آج ہم ایک دور انقلاب کو پورا کر چکے ہیں۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں۔ اور ہم ہی ان صفحوں میں زیب عنوان بن سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لئے تیار بھی ہوں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو۔ کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جو اب نقش و نگار تمہیں اس ہندستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں وہ تمہارا ہی قافلہ لایا تھا، انھیں بھلاؤ نہیں۔ انھیں چھوڑو نہیں ان کے وارث بن کر رہو اور سمجھ لو کہ تم بھاگنے کے لئے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آج زلزلوں سے ڈرتے ہو کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود خود ایک اجالا تھا۔ یہ بادلوں کے پانی کی سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے ڈر سے اپنے پائنچے چڑھا لئے ہیں وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اتر گئے پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا بجلیاں کڑکیں تو ان پر مسکرا دیئے، بادل گرجے تو قہقہوں سے

جواب دیا۔ صرصر اٹھی تو رخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں تو ان سے کہہ دیا کہ تمھارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جانکنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبانوں کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا۔ عزیزو! میرے پاس تمہارے لئے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے ۱۴ سو برس کا پرانا نسخہ ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائنات انسانی کا سب سے بڑا محسنؐ لایا تھا۔ اور وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان: لا تھنوا ولا تحزنو وانتم الاعلون ان کنتم مومنین!

خواجہ غلام السیدین

آدمی اور انسان

قطرے سے گہر بننا آسان ہے۔ لیکن آدمی سے انسان بننا بہت مشکل ہے۔

پتھر کے زمانے کا غاروں میں رہنے والا انسان جس کا گھر جانوروں کے بھٹوں سے بہتر نہ تھا اور یقیناً مکڑی کے جالے جیسا نفیس اور نازک یا شہد کی مکھی کے چھتے کی طرح منظم نہ تھا صنعت گری کے اس مقام تک پہنچ گیا کہ اس کی انگلیوں کے نیچے تاج محل کے خواب مرمریں نے جنم لیا اور اس کا ٹٹولنے والا دماغ ترقی کرتے کرتے آئین اسٹائن کا منور ذہن بن گیا جس کی جودت نے ان تاریکیوں کا سینہ چاک کر دیا جس میں آفرینش عالم کے بے شمار بھید چھپے ہوئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اخلاقی شعور نے بھی اتنی ترقی کی کہ جس دنیا میں جنگل کا قانون رائج تھا، وہاں سقراط۔ مسیح۔ بدھ۔ اور محمدؐ جیسے انسان پیدا ہوئے جنہوں نے زندگی کو شرافت سچائی اور نیک عمل کی نئی جہتوں سے آشنا کیا اور ہر زمانے اور ہر ملک میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جن کو دیکھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کیا بن سکتا ہے ــــ ان کے

برخلاف بیشتر انسانوں کا قد اس قدر چھوٹا، ان کے دل اور دماغ اس قدر تنگ، ان کی حرکتیں ابھی تک بربریت کے اس درجہ نزدیک ہیں کہ شاعر حیران ہو کر پوچھتا ہے۔

ہر نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

اور کس درجہ ارزانی؟

—— آدمی کو انسان بنانے کے جہاد میں ہر نیک نیت شخص کو شریک ہونا ہے، اس عقیدے کے ساتھ کہ دوسروں کی محرومی میری محرومی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ بہت سے لوگ جو بدباطن نہیں، جو جان بوجھ کر شر کی حمایت یا علم برادری کرنے کو تیار نہیں، عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ بدباطنوں اور شر پرستوں کی مخالفت مول نہ لیں ان میں اتنی اخلاقی جرات نہیں کہ وہ کھلم کھلا کلمہ حق زبان پر لائیں یا جھوٹ اور ظلم کے خلاف کسی عملی تحریک میں شریک ہوں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شر پسندوں اور فتنہ پھیلانے والوں کی ایک چھوٹی سی تعداد پوری جماعت یا قوم کے ضمیر کو مفلوج کر دیتی ہے اور اس طرح ان کی اخلاقی زندگی کی بنیادیں ہل جاتی ہیں —— "شر کی کامیابی کے لئے صرف اتنی شرط ہے کہ اچھے آدمی کچھ نہ کریں" (برک) یعنی ان کا ترک عمل ہی اس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اس لئے ہمارے سامنے دو کام ہیں ایک تو لوگوں کے اخلاقی اور ذہنی معیار کو بلند کرنا تاکہ وہ آدمی سے انسان کی منزل تک پہنچ سکیں، یا کم سے کم ان کے قدم اسی طرف بڑھتے رہیں؛ دوسرے شرافت اور انصاف کے حق میں ایک مضبوط رائے عامہ پیدا کرنا جو ان افراد اور جماعتوں اور تحریکوں کی سختی سے مخالفت کرے جن کی خواہش زندگی کو نیچے گرانے اور اس کی شرافتوں کو مجروح کرنے کی ہے۔

آدمی کو انسان بننے کے لئے بنیادی شرط ہے دل میں دوسروں کے لئے گنجائش، ان کے دکھ سکھ اور نفع نقصان کا زندہ احساس۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر لوگوں کی زندگی کا مرکز خود ان کی اپنی ذات ہوتی ہے وہ خود غرضی کو ایک کمبل بنا کر اپنے گرد لپیٹ لیتے ہیں تاکہ اپنے نازک جسم کو سرد ہوا سے محفوظ رکھیں انھیں اس کی فکر نہیں ہوتی کہ طوفان میں دوسروں پر کیا گزرتی ہے۔ وہ ایک کنجوس زر پرست کی طرح اپنی زندگی کو اپنے ذاتی آرام یا نفع کی خاطر سینت سینت کر خرچ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ زندگی سے، دنیا سے، اپنے عزیزوں سے، دوستوں، ساتھیوں کا کام شریکوں سے لینا چاہتے ہیں انھیں کچھ دینا نہیں چاہتے ان کا اصول تصرف ہے خدمت نہیں۔ ان کو قوت کی تلاش ہے، وہ محبت کے معجزے سے نا آشنا ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو انسان نہیں سمجھتا میری نظر میں انسان وہ ہے جو خود غرضی کی تنگ نالے سے نکل کر انسانی ہمدردی کے سمندر میں، اپنی ناؤ چلائے .... اسی لئے میں ان مال مست دولت مندوں کو برخود غلط عالموں کو ان خود پسند جمال پرستوں کو ان گوشہ نشین مردم بیزار ریاضت گزاروں کو بھی انسان نہیں سمجھتا جو اپنی دولت یا علم یا فن یا عبادت پر نازاں یا مطمئن ہیں اور انھیں اس بات کی پروا نہیں کہ ان کے کروڑوں ہم جنس روشنی کے اس محدود دائرے سے باہر افلاس جہالت، بدذوقی اور خدا ناشناسی کی تاریکی میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ایسے لوگ ایک طرح کے سرمایہ دار ہیں، حرف حق کے پیامبر نہیں کہ اس کو دوسروں تک پہنچائیں وہ ان پر باہر سے برتری کے انداز میں حکم لگا سکتے ہیں ان کی زندگی میں شریک نہیں ہوتے، ان کے دل میں نہیں اترتے۔ ان مجبوریوں اور محرومیوں کو نہیں دیکھتے جو ان کے نصیب میں آئی ہیں، کسی خارجی تقدیر کے ہاتھوں نہیں بلکہ سماج کی سنگدلی اور بے اعتنائی کی وجہ سے انہیں آدمیت کے اس مقام سے آشنا کرنے کی ضرورت ہے کہ

آدمیت احترام آدمی　　　　با خبر شو از مقام آدمی

ہمارے امیر ابھی تک حال مست ہیں لیکن حال کے تقاضوں سے بے خبر، اور ہمارے فقیر کھال مست ہیں اور ذوق سعی و عمل سے ناآشنا۔ ان کو

دولت کے نشے سے ہوشیار اور ناجائز رعایتوں کی زنجیروں سے آزاد کر کے سماجی خدمت کے لیے تیار کرنا ہے اور انھیں جھوٹی قناعت کے پھیر سے نکال کر زندگی پر صبر کر لینے کی بجائے ایک بہتر زندگی کی جدوجہد کے واسطے آمادہ کرنا ہے ـــــــ باوجود سائنس کی ترقی اور علاج کی بڑھتی ہوئی سہولتوں کے اب تک بیماری ہمارے ملک میں عام اور صحت کمیاب ہے اکثر لوگ تو کسی خاص بیماری کے نہ ہونے کو صحت سمجھتے ہیں گویا وہ ایک منفی کیفیت ہے زندگی کی رگوں میں حوصلے اور بشاشت کے خون دوڑنے کا نام نہیں۔ چاروں طرف دیکھئے تو اندازہ ہوگا کہ ہمارے بچوں میں بچپن کی شگفتگی اور جوانوں میں جوانی کی رونق اور امنگیں نہیں اور بالغ وقت سے پہلے بڑھاپے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ملک کی اوسط عمر ۲۷ سال کے قریب ہے ـــــــ غریبی اور بے کاری کا ابھی تک دور دورہ ہے، غربت کا تو یہ عالم ہے کہ بیشتر لوگوں کو دو وقت پیٹ بھر کھانا اور تن ڈھانکنے کو کپڑا نہیں ملتا۔ اور بے کاروں کے زمرے میں نہ صرف وہ کروڑوں افراد شامل ہیں جنھیں کرنے کو کام نہیں بلکہ وہ تمام کسان اور مزدور بھی جو سال کے کچھ حصے میں مصروف اور کچھ حصے میں بے کار رہتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی صلاحیت عمل سے نہ خود فائدہ اٹھاتے ہیں نہ سماج کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک خاص بڑی جماعت پیشہ ور بھیک مانگنے والوں مذہب کے نام پر خیرات کھانے والوں اور بے کار دولت مندوں کی ہے جو کوئی مفید سماجی کام نہیں کرتے سماج کی دولت میں اضافہ نہیں کرتے بلکہ طفیلیوں کی زندگی بسر کرتے ہیں ان سب کو ایک باعمل اور کارکن سماج کے دائرے میں لانے کی ضرورت ہے عام لوگوں خصوصاً نئے تعلیم یافتہ طبقے کے دل اور دماغ کی ذہنیت نکال کے اس خیال کا بیج بونا ہے کہ علم ذہانت دولت اور اثر و رسوخ کے تمام عطیے بیکار ہیں اور بے فیض ہیں اگر انھیں اپنے ہم جنسوں کی خدمت میں استعمال نہ کیا جائے۔ یہ کام نہ چھوٹا ہے نہ آسان لیکن زندگی میں چھوٹی چیزوں کی تلاش اس بات کا ثبوت ہے کہ بدن میں جان باقی نہیں رہی،

سہل را جستن درین دیر کہن   ایں دلیل آں کہ جاں رفت از بدن

محمد مجیب

سالانہ روداد

جناب امیر جامعہ، جناب ٹل گاؤ کر صاحب، خواتین اور حضرات

مجھے اس وقت آپ کے سامنے جامعہ کی ایک سال کی رپورٹ پیش کرنا ہے؛ یعنی یہ بتانا کہ اس سال کے دوران میں کیا ہوا اور کیا نہیں ہو سکا جو ہوا وہ کیسے ہوا، اور جو نہیں ہو سکا اس کا سبب کیا تھا۔ تعلیم کے لئے مناسب انتظام کی ضرورت ہوتی ہے اور ان وسائل کی جو اس انتظام کے لئے درکار ہوں مگر شاید تعلیم کی اصل قدریں نصاب، بجٹ، عمارتوں طالب علموں کی تعداد بیان کرنے سے نظر کے سامنے نہیں آتی ہیں۔ اور اس وقت ہندستان میں تعلیم گاہوں اور طالب علموں کی جو حالت ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہہ کر بہت تسلی ہوتی ہے کہ جامعہ میں کچھ نہیں ہوا۔ اس لیے میں نے اس رپورٹ کو تیار کرتے وقت رجسٹرار صاحب سے کوئی مدد نہیں لی بلکہ یہ سوچا کہ شاعر کا یہ مصرع ہمارے حسب حال ہے یا نہیں کہ

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے

منزل کا ذکر بے موقع نہیں ہے۔ ایک سال سندیں تقسیم کرنے کے بعد جب پھر اسی طرح سندیں تقسیم کرنے کا وقت آتا ہے تو واقعی محسوس

ہوتا ہے کہ ہم ایک منزل سے چل کر دوسری منزل تک پہنچ گئے ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ کیا یہ احساس زمین کی گردش پیدا کرتی ہے یا کوئی اور طاقت، کوئی اور جذبہ، کوئی اور تڑپ، جسے شاعر کی طرح ہم بھی عشق کہہ سکتے ہیں؟

جامعہ کو جب سے یونیورسٹی کا اسٹیٹس ملا ہے نئے استادوں کا تقرر ہوتا رہا ہے۔ ان میں سے بعض خود چلے گئے، بعض کو خود ہم نے رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ بیشتر اس طرح آئے اور رہے کہ جیسے انھیں ایک اجنبی شہر میں کسی جان پہچان والے کا گھر مل گیا ہو، اور گھر اور گھر والوں کی کیفیت دیکھ کر وہ اسے اپنا گھر سمجھنے لگے ہوں۔ مجھے ایک زمانہ یاد ہے جب جامعہ میں نئے اور پرانے کا فرق کیا جاتا تھا اور نئے لوگوں کو پرانے بننے میں خاصی مدت لگتی تھی۔ ہمارے لیے یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ اب پرانے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کا حق زیادہ ہے اور نئے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کا حق کم ہے، سب میں ایک برابری سی پیدا ہو جاتی ہے۔ جامعہ کا شمار غریب اداروں میں ہوتا ہے اور شاید ایک عرصے تک ہوتا رہے گا۔ لیکن بزرگوں نے قناعت کی جو تعلیم دی ہے اس کا بھی ہم پر اثر ہے اور تجربے سے ہم نے معلوم کیا ہے کہ اس قناعت کی وجہ سے چاہے وسائل میں اضافہ نہ ہو، آدمیت کی جو دولت ہے وہ ضرور بڑھتی رہتی ہے۔ ہمارے یہاں جو نئے استاد آتے ہیں وہ دیکھتے ہوں گے کہ یہاں جو اثر ہے وہ یہیں کے لوگوں کا ہے، ہم لالچ میں آکر اپنی تعلیمی خودداری کو خطرے میں نہیں ڈالتے۔ ہم جس استاد کا انتخاب کرتے ہیں اسے یقین ہوتا ہے کہ اس کا انتخاب اس کی اپنی قابلیت کی بنا پر ہوا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کو خیال رہتا ہوگا کہ اپنے ساتھیوں میں قابلیت اور انسانی خوبیوں کے ذریعہ امتیاز حاصل کرے۔ اسی وجہ سے شاید یہ خیال بھی ہوتا ہوگا کہ جو لوگ اس آزاد جمہوری جماعت میں امتیاز حاصل کر چکے ہیں ان کے طریقے کو سمجھا اور اپنایا جائے، اور ہم میں وہ ہم آہنگی پیدا ہو چلی ہے جو ہمارے کام میں مضبوطی پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔

دہلی یونیورسٹی اور اس کے مختلف کالجوں کی شہرت اور ان کے تعلیمی معیار کو دیکھتے ہوئے، اور یہ دیکھتے ہوئے کہ جامعہ نگر اوکھلا دہلی سے بہت دور سمجھا جاتا ہے، ہمیں اس کی امید نہ کرنا چاہیئے کہ اچھی قابلیت رکھنے

والے طالب علم بڑی تعداد میں ہمارے یہاں داخلے کے خواہشمند ہوں گے لیکن تعلیمی بستی میں رونق صرف علمی قابلیت سے پیدا نہیں ہوتی، جیسے گھروں میں اجالا ماں باپ اور بچوں کی صورت شکل سے ہی نہیں ہوتا۔ ہمیں خواہش ہونا چاہیے کہ ہمارے یہاں طالب علم چاہے اپنے شوق سے آئے یا مجبوری سے، یہاں آجانے کے بعد اس کا جی رفتہ رفتہ چاہنے لگتا ہے کہ ہمارے تہذیبی لباس کو اپنا لباس بنائے، اور بعض اس لباس کو پہن کر اپنی شکل آئینے میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر خود انھیں اپنی شکل دیکھنے کا شوق نہ ہو تب بھی دوسرے تو بہرحال اسے دیکھتے ہی ہیں اور اس حسن کو جو پرانے تہذیبی فن کاروں کے بنائے ہوئے زیوروں کا حسن ہے پسند بھی کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایسے لڑکے کم آئیں گے جو اپنی ذہانت کو اپنا سرمایہ سمجھ کر اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں، ایسی لڑکیاں اور بھی کم آئیں گی جو تعلیم کے زمانے کو ماڈرن اور فیشن ایبل بننے کا موقع سمجھتی ہیں۔ ایسے لڑکوں اور لڑکیوں کی دنیا سے ہم بہت دور ہیں اور اسے ہم اتنا پسند بھی نہیں کرتے کہ اس کے قریب آنا چاہیں۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگلے سال داخلوں کے وقت بڑی دشواری پیش آئے گی۔ ہم کسی شعبے میں، اور خاص طور سے کالج میں طالب علموں کی تعداد اتنی بڑھانا نہیں چاہتے کہ وہ ہمارے قابو میں نہ رہیں، اور داخلے کے لیے نمبروں کو معیار بنا کر کسی امیدوار سے کہیں گے کہ ہم تمہارا داخلہ نہیں کر سکتے اس لیے کہ میٹرک یا ہائر سیکنڈری میں تم نے بہت کم حاصل کیے ہیں تو وہ جواب دے گا کہ میں ایک امتحان پاس کر کے اس کے آگے کے امتحان پاس کرنے نہیں آیا ہوں۔ میں تو انسان ہوں اپنے اندر انسانیت کے گن پیدا کرنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے آپ کے یہاں کی تعلیم بہت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ کیا آپ میری یہ آرزو پوری نہیں کر سکتے۔ ایسے امیدواروں کی پشت پر ان کے ماں باپ بھی ہوں گے، جو اس وجہ سے بہت دکھی ہیں کہ ان کے بچے اور بچیوں کو بھیڑ بکریوں کا گلہ سمجھا جاتا ہے، اور ان کے چرواہے کبھی سائے میں بیٹھ کر سو جاتے ہیں، کبھی آپ ہی آپ ڈنڈا اچھالنے لگتے ہیں، کبھی بے پروائی میں چرانے کے لیے ایسی جگہ لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں جہاں نام کو بھی گھاس پتی نہیں ہوتی۔ ایسے امیدواروں

کو ہم کیا جواب دیں گے یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ بس اس کی امید کرتا ہوں کہ ہم صبر اور خوش اخلاقی کا حق ادا کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

عشق کی اس منزل کو ہمارے استادوں کے شوق اور ہم آہنگی اور طالبعلموں کے جوبن اور اثر لینے کی صلاحیت نے روشن کر دیا ہے۔ اس روشنی میں ہمیں راستے کی دشواریاں اور زیادہ صاف نظر آ رہی ہیں۔ لیکن ہمیں شکر ادا کرنا چاہیئے کہ یہ روشنی مختلف راستوں سے ہمارے دلوں تک پہنچ رہی ہے۔ ممکن ہے اسی وجہ سے ہمیں اپنی دشواریاں نظر کا فریب معلوم ہونے لگیں اور ہم زیادہ یقین اور ہمت کے ساتھ عشق کی اگلی منزلوں تک بڑھنے لگیں۔

ایک زمانے میں کہا جاتا تھا اور شاید صحیح بھی تھا کہ عشق آدمی کو ہر قید سے آزاد کر دیتا ہے۔ ہمارے حصے میں جو عشق آیا ہے اس کے ساتھ گھر گرہستی کی شرط لگی ہوئی ہے اور اسی شرط کو پورا کرنا سب سے مشکل ہے، اس لیے کہ وہ لوگ جن کی مدد کے بغیر یہ شرط پوری نہیں ہو سکتی اپنے قاعدوں کو دیکھتے ہیں، ہمارے عشق کو نہیں دیکھتے۔ اس جگہ جہاں کانووکیشن کا جلسہ ہو رہا ہے اسکول کی عمارت ہونی چاہیئے تھی جس کا نقشہ ہم نے تیس پینتیس برس پہلے بنوایا تھا اور جسے ہم نے اب اپنی ضرورتوں کے مطابق بدل کر منظوری کے لئے پیش کیا ہے۔ بدلنے کے بعد نقشے کے مطابق عمارت بنانے میں قریب پندرہ لاکھ خرچ ہوں گے اور جتنی دیر یہ سوچنے میں لگے گی کہ یہ پندرہ لاکھ کہاں سے آئیں اتنے ہی زیادہ روپے کا انتظام کرنا ہوگا۔ مدرسوں کے جو ہوسٹل ہوں ان کا خرچ ہم نے یہ سوچ کر مقرر کیا تھا کہ ہوسٹلوں میں رہنے والے بچے امیر گھرانوں کے نہ ہوں گے۔ اب گرانی کی وجہ سے اتنے لوگ امیر ہو گئے ہیں کہ ہم خرچ بڑھا کر بھی ایک کی جگہ دو بلکہ دو کی جگہ چار ہوسٹلوں کو آباد رکھ سکتے ہیں، مگر نئے ہوسٹل بنانے کے لئے نہ ہمارے پاس روپیہ ہے نہ شاید کہیں سے مل سکے گا۔ لڑکیوں کے لئے صرف ایک ہوسٹل ہے۔ اور ہمارے یہاں لڑکیوں کی تعداد بہت تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔ اگر ہم ایک ہوسٹل اور بنا سکیں تو اس وقت ہوسٹل میں رہنے والی لڑکیوں کو جو تکلیفیں ہیں وہ دور ہو جائیں گی۔ لیکن ہم نے مجبور ہو کر لڑکیوں کا ہوسٹل بنانے کی تجویز کو ایک سال کے لئے ملتوی کر دیا ہے۔ استادوں

کے مدرسے میں جگہ کی بہت تنگی ہے، کالج میں نئی عمارت بننے کے باوجود بھی تنگی رہے گی۔ اور اب یہ فکر سوار ہے کہ سائنس کی تعلیم کے لئے جلد سے جلد الگ عمارت بنوائی جائے۔ اسی سلسلے میں میں کالج کے لئے ہوسٹل کی ضرورت بیان نہ کروں تو گویا جامعہ کا ایک اہم تعلیمی مقصد نظرانداز ہو جائے گا۔ یو۔جی۔سی کی اسکیم کے مطابق ہمیں ایک اسٹوڈینٹس ہوم بھی بنانا چاہیے۔ آخر میں اس دشواری کا ذکر کر دوں جو استادوں کے لئے اس منزل کو واقعی عشق کی منزل بنا دیتی ہے۔ ہم پوری کوشش کرنے کے باوجود استادوں کے لئے مکان نہیں بنوا سکے ہیں اور اب معلوم ہو گیا ہے کہ جب تک زمین خریدنے کے لئے روپیہ نہ ہو گا ہم دو چار مکان بھی نہ بنوا سکیں گے ہمارے استاد یا تو ان چھوٹے چھوٹے کمروں میں گزارا کرتے ہیں جو ہم انھیں پیش کر سکتے ہیں یا بھاری کرایہ دے کر ایسے ہی چھوٹے کمرے خود حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں کام کا شوق باقی رہا عشق نہیں ہے تو کیا ہے۔

ہم خدا جانے کیوں برسوں تک یہ سمجھتے رہے کہ ہمارا کوئی طالب علم مرکزی کتب خانہ کا ممبر نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کی الگ سے کوئی فیس ادا نہ کرے۔ اور کوئی اس کی طرف سے ضمانت نہ دے۔ اب ہماری غلط فہمی دور ہو گئی ہے اور کتب خانہ میں بہت زیادہ طالب علم نظر آتے ہیں۔ ادھر بجٹ منظور کراتے وقت ہمیں مجلس مالیات کو یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ جامعہ تعلیمی ادارہ ہے۔ اس کے کتب خانوں میں کتابیں ہونی چاہئیں اور ریڈنگ روم میں رسالے۔ وزارت تعلیم سے اچھی کتابوں کی خریداری کے لئے بہت کم ملتا ہے اور یو۔جی۔سی بھی شاید ہمارے ساتھ ایسی فیاضی نہیں برتتی جیسی کہ قانونی یونیورسٹیوں کے ساتھ، پھر بھی کتابوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، اور اسی کے ساتھ پڑھنے کا شوق بھی۔

جناب امیر جامعہ

جامعہ کا نیا دستور آج سے عمل میں آ رہا ہے۔ یہ دستور، سرکاری یونیورسٹیوں کے قاعدے قانون سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے اور اسے نافذ کر کے ہم گویا اعلان کر دیں گے کہ قانون قاعدے کے اعتبار سے ہم بھی اور ہندستان

کی یونیورسٹیوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا اس طرح ہم نے ان مقاصد کو خیرباد کہا ہے جس کی خاطر جامعہ قائم ہوئی تھی؛ اور زمانے کے ہاتھوں شکست کھا کر تسلیم کر لیا ہے کہ جامعہ کو اچھی تعلیمی خصوصیات کا قومی تعلیمی ادارہ بنانے کی خواہش غلط تھی۔ کیا ہم نے ایثار اور قربانی کے حوصلے کو ترک کر کے دنیا سے جو کچھ مل سکے اسے وصول کر لینے کا ارادہ کیا ہے؟ کیا ہم اب یہ دیکھیں گے کہ جتنی تنخواہ ملتی ہے کہیں اس سے زیادہ کام تو نہیں لے لیا جاتا، یا وہ شخص جو کام کے بدلے تنخواہ لیتا ہے کہیں اپنے حق سے زیادہ تو وصول نہیں کر لیتا؟ کیا ہم میں اب وہ یگانگت نہیں رہے گی جو ایک ساتھ مصیبتیں جھیلنے والوں میں پیدا ہو جاتی ہے اور ہم میں سے ہر ایک کو بس اپنی فکر ہوگی کہ کم سے کم کام کر کے زیادہ سے زیادہ تنخواہ وصول کرے۔

جناب والا ـــــ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جامعہ کا نیا دستور سب کی مرضی سے بنا ہے اس کی وجہ سے جامعہ کے مقاصد میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے؛ جامعہ کے حیاتی اراکین کی نمائندگی مجلس منتظمہ میں کم ہو گئی ہے تو اس کے بجائے وہ لوگ مجلس میں آ گئے ہیں جن پر جامعہ کے اہم تعلیمی اور انتظامی کاموں کی ذمے داری ہے اور جن کے مشورے کے بغیر کوئی بڑے فیصلے کرنا جامعہ کے حق میں مفید نہیں ہے سرکاری گرانٹ انجمن کے فیصلے کے مطابق قبول کی گئی اور جب مالی ذمہ داری پوری حکومت نے لیلی تو یہ لازمی تھا کہ اختیارات ایسی مجلسوں کے ہاتھ میں آجائیں جو تعلیم اور انتظام کے سارے کام کرتی ہیں اور جنھیں حکومت اپنے قاعدوں کے مطابق ذمہ دار مانتی ہے دوسری یونیورسٹیوں کے سے قاعدے بنانے میں جامعہ کے کارکنوں کو کوئی نقصان نہیں ہوا ہے اور ایسے فیصلے جو بطور خاص کیئے جاتے تھے اور بعد میں الجھنیں پیدا کرتے تھے اب بہت کم ہوتے ہیں۔ فقہی بحث کرنے والا یہ ضرور کہے گا کہ اب جامعہ میں اسلامی رنگ نہیں رہا مگر آپ کو یاد ہوگا کہ اب سے چالیس برس پہلے بھی فقہی بحث کرنے والے کہتے تھے کہ جامعہ اسلامی ادارہ نہیں ہے اور اس وقت بھی ہم نے گوارا نہیں کیا کہ دین کی روشنی کو قانون کے پردے میں چھپایا جائے۔ ریا ایثار اور قربانی کا جذبہ سو اسے ہم نے کبھی ہاتھوں کی ہتھکڑی اور پاؤں کی زنجیر نہیں بنایا، ہم سے کبھی بھی دنیا دار خوف کھا کر نہیں بھاگتے تھے

اور دین داروں سے ہم نے آنکھ ملا کر بات کی اپنے اس رویّے کی وجہ سے ہم ریاکاری کی بلا سے بچے رہے؛ اور اب اگر کہا جاتا ہے کہ تنخواہ اور گریڈ اور دوسری مراعات کے لحاظ سے ہم میں اور دوسری یونی ورسٹیوں کے استادوں اور کارکنوں میں کوئی فرق نہیں ہے تو ہم بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہہ دیتے ہیں کہ جی ہاں! اب ایسا ہی ہے۔ ہم پہلے کم تنخواہوں پر راضی تھے اور اب زیادہ پہ راضی ہیں۔ ہمیں پہلے جفاکشی پر ناز نہیں تھا۔ کام کو کام سمجھ کر کرتے تھے۔ اب بھی کام کو کام سمجھ کر کرتے ہیں، جفاکشی کی ضرورت نہیں رہی تو اس کا غم کیوں کریں۔

اب اجازت دیجئے کہ جس شعر کے پہلے مصرع سے میں نے رپورٹ شروع کی تھی اس کا دوسرا مصرع بھی پڑھ دوں کہ جس حقیقت کا اب تک ذکر نہیں ہوا ہے وہ بھی بیان ہو جائے،

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے
اور چمکا ترا نقشِ کفِ پا آخرِ شب

گاندھی جی کہاں ہیں؟

"گاندھی جی کہاں ہیں؟ مولانا روم نے ان کے اور اپنے جیسے تمام لوگوں کی طرف سے اس سوال کا ایک جواب دیا ہے۔

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجوے
در سینہ ہائے مردم عارف مقام ماست

ہمارے مرنے کے بعد ہماری قبر کو زمین میں تلاش نہ کرو، ہمارا مقام عارفوں کے سینوں میں ہے مگر اس جواب سے ہماری مشکل آسان نہیں ہوتی صرف نظر دوسری طرف پھر جاتی ہے۔ ہم سمجھ جاتے ہیں کہ کسی کی نیکی اور سچائی اس کے مرنے کے بعد اس کے بدن کی طرح مٹی میں نہیں مل جاتی، مگر یہ عارف، یہ گیان اور دھیان والے، یہ نیکی اور سچائی کو پہچاننے والے جن کے سینوں میں نیکی اور سچائی ہمیشہ ہمیشہ زندہ اور آباد رہتی ہے کون ہیں اور کہاں ہیں۔
کیا وہ سیاست کی دنیا میں ہیں جہاں قوموں کی قسمت کا فیصلہ ہوتا ہے جہاں طاقت اور دولت کے مقابلے ہوتے ہیں، جہاں بلوان جیتتا ہے اور کمزور ہارتا ہے جھوٹ بولنے والا آگے چلتا ہے اور سچ بولنے والا تھکا ہارا اس کے

پیچھے پیچھے؟ کیا یہ عارف علم کی دنیا میں ہیں جہاں ایک شک دور ہوتا ہے تو دس نئے شک پیدا ہو جاتے ہیں، ایک گتھی سلجھنے سے ہزار نئی گتھیاں پڑ جاتی ہیں، جہاں سچ صرف وہ ہے جو ثابت کیا جا سکے، جہاں ایمان کی مضبوطی پر علم اور عقل کی کمی کا گمان کیا جاتا ہے، جہاں محنت بے حساب کی جاتی ہے اور حاصل کا کوئی حساب نہیں لگایا جاتا؟ کیا ہمیں عارفوں کو ان لوگوں میں تلاش کرنا چاہیے جو سماج کا سدھار کرنا چاہتے ہیں؟ ان میں کوئی ہوتا ہے جو سمجھتا ہے کہ اس نے علم اور اخلاق کی اصل دولت حاصل کر لی ہے، اس کا کام اس دولت کو تقسیم کرنا ہے اور جو اپنا حصہ لینے کے لئے ہاتھ نہ بڑھائے وہ نکما ہے، کوئی ہوتا ہے جو اپنی عزت اور حیثیت بڑھانے کے لئے نئے خیالات کا پرچار کرنے لگتا ہے، اور اپنا کام نکالنے کے لئے خلوص اور سچائی کو ناپنے کے نئے نئے پیمانے بناتا رہتا ہے، کوئی ان خاص قدروں کو جو اس کی نظر میں اہمیت رکھتی ہیں اتنا بڑھا چڑھا دیتا ہے گویا اس سے برتر کوئی قدر نہیں ہو سکتی، اور سب کے سب سیوا اور سدھار کے نام سے انسانوں کو تختۂ مشق بناتے ہیں؟ کیا عارفوں کی تلاش ان لوگوں میں کرنا چاہیے جو تعلیم دینے میں مصروف ہیں اور جن کا منصب نئی نسلوں کی تربیت اس طرح کرنا ہے کہ علم بڑھتا رہے، حوصلے بلند ہوتے رہیں اور طبیعتیں زیادہ پاک اور اخلاقی اور روحانی قدروں کی خدمت کے لئے زیادہ آمادہ ہوتی رہیں؟ تعلیم دینے والوں میں کوئی ایسا پیدا ہو جاتا ہے جس کے دل میں وہ درد اور ذہن میں وہ روشنی ہوتی ہے جو دوسروں کی تربیت کے لئے ضروری ہے، ویسے تعلیم دینا ایک پیشہ ہے جس کا حق ادا کرنا بہت مشکل کام نہیں۔ سرکاری ملازموں اور دنیا کے کام دھندے کرنے والوں میں عارف تلاش نہیں کئے جاتے۔ اگر گاندھی جی کا مقام عارفوں کے سینوں میں ہے تو ہمیں یہ عارف کہاں ملیں گے۔؟

ہمارے لیڈروں کے لئے آزادی کے بعد سے اہنسا کا اصول بڑی دشواریاں پیدا کرتا رہا ہے۔ ہم جانتے تھے کہ ہر ملک کو اپنی حفاظت کے لئے فوج رکھنے کی ضرورت ہے اور ہم نے سوچا یہ کہ فوج کو صرف حفاظت کے لئے استعمال کریں گے۔ دنیا کو ہم یقین دلاتے رہے کہ ہم امن اور شانتی چاہتے ہیں اور جب کبھی ہمیں موقع ملا انٹرنیشنل معاملوں میں ہم نے سمجھا بجھا کر اور

اخلاقی دباؤ ڈال کر حقدار کو اس کا حق دلایا اور جنگ کی آگ بھڑکی بھی تو اسے کوشش کر کے بجھا دیا۔ اسی کے ساتھ ہم کہتے رہے کہ ہمیں اہنسا کا اصول گاندھی جی سے ورثے میں ملا ہے۔ اور ہم اُسے چھوڑ نہیں سکتے۔ ہم یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ ہمارے لیڈروں نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک کیا۔ ہندستان کو امن اور دوستی کے راستے پر لے جانے کے لئے جواہر لال نہرو اور لال بہادر شاستری سے بہتر رہنما نہیں مل سکتے تھے، مگر یہ دونوں بھی اپنی مرضی کے خلاف جنگ کرنے کے لئے مجبور کئے گئے" اور اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری سیاست اہنسا کی پابند رہی ہے اور رہے گی!!!

ملک کی حفاظت کی تدبیریں کرنے والوں میں ہمیں وہ عارف نہ ملیں گے جن کی ہمیں تلاش ہے۔ کیا یہ ملک کی ترقی کی تدبیریں کرنے والوں میں ملیں گے؟ ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہماری ترقی کی ذمہ داری صرف ان لوگوں پر ہے جو پنج سالہ پلین بناتے ہیں، پبلک سکٹر، یعنی سرکاری یوجناؤں کی حدوں اور کاموں کو بڑھانے کی تدبیریں کرتے ہیں، پرائیویٹ سکٹر کو قابو میں رکھنے، اناج کی پیداوار بڑھانے اور ہر جگہ ضرورت کے مطابق اناج فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل کچھ نہیں کر سکتے اگر جنتا ان کا ساتھ نہ دے۔ پلین بنانے والوں نے غلطیاں کی ہوں گی، مگر جنتا کی طرف سے انھیں کوئی سہارا بھی نہیں ملا۔ کسان کو اس کا بالکل خیال نہیں ہے کہ قوم کی ضرورت کے مطابق اناج پیدا کرے، وہ زیادہ سے زیادہ آمدنی چاہتا ہے اور انھیں چیزوں پر توجہ کرتا ہے جن کے بونے سے آمدنی زیادہ ہوتی ہے۔ بیوپاری کو ہمیشہ اور ہر جگہ اپنے منافع سے مطلب ہوتا ہے، مگر ہمارے یہاں معلوم ہوتا ہے بیشتر بیوپاری بھول گئے ہیں کہ ان کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ لوگوں کی ضرورتیں پوری کریں۔ حکومت کا بیوپاریوں پر بس نہیں چلتا اس لئے کہ خریدار دیوانے ہو گئے ہیں اور ذرا بھی اندیشہ ہوا کہ کوئی مال کمیاب ہو جائے گا تو زیادہ سے زیادہ خرید کر اپنے گھروں میں بھر لیتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچوں کو دودھ کا پاؤڈر نہیں ملتا اس لئے کہ شوقین لوگ کافی اور پڈنگ میں بہتر مزہ پیدا کرنے کے لئے دودھ کے ڈبے زیادہ دام دے کر خرید لیتے ہیں۔ کیا سیاست اور کاروبار کی اس دنیا میں وہ لوگ ملیں گے جن کے سینوں میں گاندھی

جی کے اصولوں کی روشنی نظر آئے۔؟

اور ہم تعلیم کا کام کرنے والے دوسروں کو کیا کہیں، ہمارے اپنے سینوں میں کون سی روشنی ہے؟

گاندھی جی کی آرزو تھی کہ ہندستان کی زبان ایک ہو۔ "ہندی یعنی ہندستانی" جسے دیوناگری اور اردو لپیوں میں لکھا جائے۔ ہم نے زبان کو ایک سیاسی مسئلہ بن جانے دیا، ہندوستانی بولتے رہے، اسے پسند کرتے رہے مگر اسے سیکھنا سکھانا بند کر دیا۔ ادھر ہندی کو جنتا کی زبان کہتے رہے، اور اسے اتنا مشکل اتنا مشکل بنا دیا کہ وہ جنتا کی زبان ہو ہی نہیں سکتی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انگریزی کی حیثیت بڑھ گئی ہے، تعلیم اور تہذیب میں اس نے اپنے قدم جمالئے ہیں اور اب ماں باپ عام طور پر یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے اور کچھ سیکھیں یا نہ سیکھیں انگریزی ضرور پڑھیں، معلوم ہوتا ہے ہماری بول چال کی زبان مدتوں تک ادھ گلے چانول اور دال کی کھچڑی رہے گی اور ادبی زبان درجۂ اول انگریزی اور درجۂ دوم ہندی یا علاقائی زبان ہوگی۔ ہم تعلیم کا کام کرنے والوں ہی نے بنیادی تعلیم کو بھی ایک سرکاری منصوبہ اور سیاسی مسئلہ بن جانے دیا۔ خود حرفے نہیں سیکھے، حرفوں کے ذریعہ تعلیم پر بحث کرتے رہے۔ مضمون اور حرفے کے ربط CORREALATION کو ایک گورکھ دھندا بنا لیا، اور اب سارا کام بگاڑنے کے بعد ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر پوچھتے ہیں کہ بنیادی تعلیم کیا ہے۔ گاندھی جی ایسے استاد چاہتے تھے جو تعلیم کو عبادت سمجھیں، اور اس کام کو کرنے کی خاطر سب کچھ تج دیں۔ ہم تنخواہ کے لئے اور عزت کے لئے اسی طرح لڑتے ہیں جیسے وہ لوگ جو تنخواہ اور صرف تنخواہ کے لئے کام کرتے ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ ہم نے کام میں جی لگانا چھوڑ دیا ہے۔

لیکن اگر یہ سب صحیح ہے تو کیا وہ لوگ کہیں ملیں گے ہی نہیں جن کے سینوں میں گاندھی جی کی تعلیمات محفوظ ہوں؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہمیں طے کر لینا چاہیئے کہ گاندھی جی کی تعلیمات کیا تھیں۔ بعض اصولوں کو انھوں نے صرف اپنے لئے پسند کیا تھا، جیسے کہ برت رکھنے کو، بعض معاملوں میں وہ ایک خاص رائے رکھتے تھے اور اسے صحیح سمجھتے تھے، جیسے کہ دیہاتی صنعتوں یعنی گرام ادیوگ میں ایسے اوزار اور مال تیار کرنے کے طریقے اختیار

کرنا جو غریب دیہاتیوں کے بس میں ہوں۔ ہم کو دوسرے اہم ملکوں سے امداد نہ ملتی اور ہم میں اتنی ہمت ہوتی کہ مدد مل سکنے پر بھی ہم اپنے کام اپنے ہی ہاتھوں سے کرتے اپنی ضرورت کی مشینیں خود ایجاد کرتے تو ہم کو معلوم ہو جاتا کہ گاندھی جی کی رائے صحیح تھی، اور دوسری طرف گاندھی جی کو یقین ہو جاتا کہ غریبوں اور بے روزگاروں کا فائدہ اس طریقے کو اختیار کرنے میں ہے جسے ہمارے پلاننگ کمیشن نے تجویز کیا ہے تو غالباً وہ اس کی مخالفت نہ کرتے جن معاملوں کا حق اور حق پرستی سے تعلق ہے، جیسے کہ دیس کے تمام لوگوں کو برابر سمجھنا، انصاف اور محبت کے ذریعے ان میں اتحاد قائم رکھنا، یہ گاندھی جی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے تھے، ان کے لئے وہ جان دینے پر تیار رہتے تھے اور انھوں نے اپنی جان دے بھی دی، اسی طرح ان کی یہ کوشش کہ اپنے آپ کو اپنے مقصد کے لئے بہتر سے بہتر آلہ کار بنائیں، یعنی یہ سمجھ کر کہ وہ حق کے خادم ہیں اپنے آپ کو خدمت کے لئے ہر طرح سے موزوں بنائیں، اور کوئی عادت، کوئی رجحان، کوئی ذاتی خواہش یکسوئی کے ساتھ خدمت کرنے میں رکاوٹ نہ بن سکے، یہ بھی ہمارے لئے ایک مثال ہے جسے سامنے رکھے بغیر کوئی بڑا کام انجام نہیں دے سکتے۔

گاندھی جی کے زمانے میں قومی اتحاد ایک سیاسی مسئلہ تھا اور تہذیب کی بات سیاست کی خاطر کی جاتی تھی۔ اب قومی اتحاد ایک تہذیبی اور اخلاقی مسئلہ ہے جس پر ہمارے سیاسی مستقبل کا دارومدار ہے۔ اس وقت اگر ہم گاندھی جی کی پیروی کرنا چاہیں تو قومی اتحاد، جسے ہم نیشنل انٹگریشن کہتے ہیں، سب سے اچھا میدان ہے جس میں ہم اپنی تمام ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو بروئے کار لا سکتے ہیں، اور جیسے ڈاکٹر اقبال نے خدا کو دعوت دی تھی کہ میرے سینے میں آکر تھوڑی دیر کے لئے آرام کر لیا کر، ہم گاندھی جی کو دعوت دے سکتے ہیں کہ وہ ہمارے سینوں کو اپنا مقام بنایا کریں۔ مگر سمجھ لیجئے کہ گاندھی جی اگر ایک طرف روادار تھے تو دوسری طرف بہت سخت بھی تھے، ہم میں سے جو ہندو ہیں وہ انھیں بلائیں گے تو وہ کہیں گے کہ مجھے تم تو بلا رہے ہو، مگر یہ تو بتاؤ کہ تم نے میرے مسلمان اور سکھ اور ہریجن بھائیوں کے لئے بھی جگہ رکھی ہے!

یا نہیں اس لیے کہ میں آؤں گا تو ان سب کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ ان میں جو خرابیاں ہیں وہ میں جانتا ہوں، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ کسی وقت بھی بگڑ کر مجھ سے الگ ہو سکتے ہیں، پر مجھے تو اپنا فرض ادا کرنا ہے اور میرا فرض یہ ہے کہ میں ان سے محبت کروں وہ کوئی غلط بات چاہتے ہوں تو انہیں سمجھاؤں اور جب تک جان میں جان ہے انہیں صبر اور محبت کے ساتھ سمجھاتا رہوں اور اگر وہ نہ مانیں تو یقین رکھوں کہ یہ میرے سمجھانے کا قصور ہے اور اگر وہ مجھ سے دشمنی کریں تب بھی میں ان کے ساتھ بھائیوں کا سا سلوک کرتا رہوں، ہم میں سے جو مسلمان ہیں وہ ان سے کہیں گے کہ تمہارے پاس خوشی سے آؤں گا مگر یہ اپنے دل سے پوچھ لو کہ میرا آنا تم پر بار تو نہیں ہوگا۔ میں تمہارے مزاج کو پہچانتا ہوں، تم جسے اپنا سمجھتے ہو اس پر سب کچھ فدا کرنے کو تیار ہو جاتے ہو، لیکن اگر اس نے تمہارے مزاج کے خلاف کوئی بات کہہ دی یا کر دی تو اپنے غیر بن جانے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ تم ہندستان میں اسلام اور اسلامی تہذیب کے نمونے بن کر رہو، اور دکھاؤ کہ مسلمانوں کو ہندستان کی ترقی اور بہبودی کی کسی سے کم فکر نہیں ہے، ملک کی سیوا کرنے میں وہ جان کھپانے پر تیار ہیں، ان کی دوستی میں عشق کا رنگ ہے، ان کے عمل میں جہاد فی سبیل اللہ کا عکس، جیسے میں اگر وہ کہتا ہوں اب یہ تمہارا کام ہے کہ میری بات پر بھروسہ کرو، میری خواہشوں کو اپنا فرض بنا لو۔

شاید ہم سب زبان سے ان شرطوں کو ماننے پر تیار ہو جائیں گے، ایسے مہمان کو بلانے میں کسے تامل ہوگا، لیکن ہمارے دلوں کے دروازے ابھی تک کھولے نہیں کھلتے۔ اس وقت ہم سے پوچھا جائے گا کہ گاندھی جی کہاں ہیں تو ہم کیا جواب دے سکتے ہیں، سوا اس کے کہ وہ باہر انتظار کر رہے ہیں اور ہم انھیں اندر نہیں بلاتے۔ آج کے دن ہمیں سوچنا چاہیے کہ یہ صورت کب تک رہے گی ہمارے دلوں کے دروازے کب تک بند رہیں گے۔ مہمان کب تک باہر کھڑا رہے گا۔

سید وصی احمد بلگرامی

یادِ پاسنین

دیر و حرم کا افسانہ

ایک مسلمان نے کسی دہریے سے پوچھا کہ تو خدا کو نہیں مانتا تو دہریے نے جواب دیا کہ تمہارا خدا ماننے کے قابل ہو تب کوئی مانے یا یوں ہی مان لے۔ تم چھیڑتے ہو تو سنو۔

زہرہ بائی پیدا ہوئی اور بڑھی تو اس کی آنکھوں کو دیکھ کر شرابی ہوشیار اور ہوشیار شرابی ہو گئے۔ مگر اسی محلہ میں شریفن پیدا ہوئی تو دونوں آنکھوں سے اندھی۔ شریفن کو انکھیارے کمینوں نے زندگی بھر نہ پوچھا۔ تمہارا خدا اگر انصاف ور تھا تو اس نے شریفن کو اندھا پیدا کر کے فاقے کیوں کرائے۔ اور زہرہ بائی کو چشمِ میگوں دے کر بادۂ عشرت کیوں پلایا؟

عین طوفان میں ایک بچہ تباہ شدہ کشتی کے تختے پر پیدا ہوتا ہے، ماں فوراً مر جاتی ہے، سمندر کا تلاطم اس ٹوٹے ہوئے تختہ کو ساحل پر لگا دیتا ہے، بچہ صحیح سلامت رہتا ہے۔ اور مرنو کی طرح بڑھتا ہے۔ اس کا عروج بہشت شداد سے پوچھ لو۔ مگر

ایک دوسرا بچہ سیٹھ کروڑی چند (عرف لاولد) کے یہاں پیدا ہوتا ہے، اور شفاء الملک کی نگرانی میں دیا جاتا ہے لیکن شفاء الملک بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے، اور نوزائیدہ دم توڑ چکا۔ اگر تمہارا خدا رحیم ہے تو لاولد سیٹھ کے جگر میں ناسور کیوں ہے؟ یہ کیا ہے کہ جو بچہ طوفان کی گود میں تھا وہ بچا لیا گیا۔ اور جو بچہ شفاء الملک کی گود میں تھا وہ چھین لیا گیا۔

مصر کے فراعنہ اپنی شادی زیادہ تر اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے کرتے تھے۔ اور جب یہ نعمتیں ان کو میسر نہ ہوتیں تب کہیں باہر سے لڑکی لاتے تھے۔ وہ اس خیال سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے میکہ والے سازش کر کے تختِ مصر کو اپنے خاندان میں منتقل کر لیں اور کبھی اس خیال سے کہ دنیا بھر کی آسائش جب اپنی لڑکی اور بہن کو خود دے سکتے ہیں تو پھر کسی داماد یا بہنوئی کی تلاش میں گدائی کیوں کی جائے۔ اور کبھی اس خیال سے اپنے خانہ باغ کی چڑیا باغ اغیار کی ہزار داستان سے اچھی ہے، بہرکیف اس فلسفہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرعون نے اپنی شادی سگی بہن، یا بیٹی سے کی تو اس کا بیٹا فرعون ۲ اپنی ماں کا سگا بھائی اور اپنی پھوپی کا بیٹا ہوا اور خود فرعون ۱ اپنے بیٹے کا نانا اور اپنے بھانجے کا باپ ہوا۔ اور فرعون ۲ کی ماں اپنے شوہر کی نواسی ہوئی۔ یہ فرعونیت تھا۔ رے خدا کو اگر بھائی نہ تھی تو اس نے ان کتوں کو تختِ مصر پر لوٹنے کیوں دیا؟ میرا روئے سخن جام فرعونیت کے اس تلچھٹ کی طرف نہیں ہے جس کو عہد موسوی کے افسانہ گر کہتے ہیں کہ تمہارے خدا نے دریائے نیل میں بہا دیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ بیسیوں فراعنہ جو صدیوں تک اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے شادیاں کرتے رہے اور جن کی نجاست سے دنیا نجس ہو گئی ایسے گدھ مصر و حبش کی شہنشاہی کے لئے کیوں چھوڑ دیئے گئے؟

واہ رے تمہارا خدا ابرہہ کی سرکوبی کے لئے ابابیلیں اور ابابیلوں کے چنگل میں کنکریاں بھیجتا ہے۔ مگر ۶۴ھ میں جب خود کلمہ گویوں نے مکہ کا محاصرہ کیا خانہ کعبہ کو نقصانِ عظیم پہنچایا اور نیز مسجد نبوی کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا اور انصار کو چن چن کر مارا۔ اور ۱۴۵ ہجری میں جب خلیفۃ المنصور نے مدینہ کا ناکہ کر کے قحط کرا دیا۔ اور امام ابو حنیفہ کو قید خانہ میں جھونکا اور امام مالک کو کوڑے لگائے اور ۳۱۷ھ میں جب ابو طاہر نے عین حج کے دن حاجیوں کو ذبح کیا۔ اور سنگ اسود کو اکھاڑ کر بائیس برس تک بیت اللہ کو بے چراغ رکھا۔ ان موقعوں

پر تمہارا خدا ابابیلوں اور کنکریوں سے مطلق کام نہیں لیتا۔ آخر کیوں؟ میزبان نے اپنے مہمان حاجیوں کو ذبح ہونے سے کیوں نہ بچالیا۔ صاحب خانہ نے گھر کو تاراج ہونے کے لئے بے پناہ کیوں چھوڑ دیا؟

یہودیوں نے حضرات عیسٰی کو طمانچے لگائے۔ منہ پر تھوکا سولی پر چڑھایا تمہارا خدا کہاں تھا کہ ایسے وفادار غلام کی ذلت دیکھتا رہا۔ تمہارے رسول کے راستہ میں کانٹے بچھائے گئے بدن پر اونٹ کی انتڑیاں ڈالی گئیں، زہر دیا گیا۔ تمہارا خدا کہاں تھا کہ اس نے اپنے حبیب کو اسی طرح نہ بچالیا جس طرح افسانہ گو کہتے ہیں کہ اس نے جناب خلیل کو آتش نمرود سے اور جناب موسیٰ کو دریائے نیل سے بچالیا؟ تمہارے رسول کے نواسے کا سر کاٹ کر نیزہ پر چڑھا دیا گیا۔ اور پھر دربار عام میں یزید کے سامنے تحفتہً پیش ہوا۔ اور یزید نے لب ہائے شہید سے گستاخیاں کیں! تمہارا خدا اس وقت کہاں تھا کہ اپنے فدائیوں کی رسوائی دیکھتا رہا۔ اور کیوں نہ ایسا ہوا کہ غضب الٰہی نے اسی وقت یزید اور یزید کے درباریوں پر بجلی گرادی؟

کیا فرماتے ہیں ہستیٔ موہوم کا کلمہ پڑھنے والے اس باب میں کہ بنی اسرائیل چیختے رہ گئے کہ اے موسیٰ تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اپنے خدا کو سامنے لاؤ۔ مگر جب جوش میں آکر موسیٰ نے نقاب پھاڑنا چاہا تو ان کا خیالی نقاب پوش للکار اٹھا کہ دور باش! حضرت موسیٰ کی اس شکست فاش کے بعد اب کس کا منہ ہے کہ خدا کی ہستی کا دعویٰ کرے؟ مدعی سست اور گواہ چست! اگر خدا تھا، تو بنی اسرائیل کے سامنے کیوں نہ آیا؟ اور اب بھی ہے تو میرے سامنے کیوں نہیں آتا!

(۲)

کلک گوہر نے دہریئے سے کہا کہ ہم تیری باتوں کا جواب یوں دیں گے کہ کسی مدرسہ میں چند طلباء اردو زبان سیکھتے تھے۔ صرف و نحو اور بالخصوص فن عروض کی بیسیوں کتابیں درس میں تھیں سالانہ امتحان میں جب طلباء شریک ہوئے اور اردو کا پرچہ سامنے آیا تو اس میں سوال تھا کہ:

مندرجہ ذیل الفاظ میں املا کی جو غلطیاں ہوں ان کو درست کر کے غیر مرتب الفاظ سے ایک شعر کہو۔

ذو ۔ ضعد ۔ دیکھے ۔ کہ ۔ ہم ۔ ے ۔ یے ۔ کور ۔ کر ۔ کو ۔ مادر ۔ یح
بلغیب ۔ کیا ۔ مانیں گے ۔ چلطے ۔ یکیں ۔ نہیں ۔ ادص ہیں ۔ رکھ

اس سوال کو دیکھ کر طلبار نے قہقہہ مارا اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ یارو ! گرہیں مکتب وہمیں ملاّ ۔ کار طفلاں تمام خواہد شد ۔ قافیے کا پتہ نہیں، ردیف کا پتہ نہیں، بحر کا پتہ نہیں مضمون کا پتہ نہیں، الفاظ کی بے سر و سامانی یہ ہے جیسے میدان جنگ سے بھاگتی ہوئی فوج کا توشہ خانہ پھر فرمائش یہ ہے کہ شعر کہو، یا تو سوال چننے والا پاگل ہے ۔ یا کوئی جناتی مذاق ہے ایسے ہذیان کا جواب دینا عقلمندوں کا کام نہیں ہے ۔

ہو بہو یہی حالت منکرین خدا کی ہے ، طلبار نے اردو کے پرچے کو ہذیان سمجھ کر اس کا جواب دینا اپنی شان کے خلاف سمجھا ۔ اور دہریوں نے خود اپنی ہستی کو اتفاقی ہذیان سمجھ کر خدا کی ہستی سے انکار کر دیا ۔ مگر طلبا اگر صبر سے کام لیتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ املا کی غلطیاں صرف نو ہیں ذو ۔ ضعد ۔ ہم ۔ ے ۔ یح ۔ بلغیب ۔ چلطے ۔ یکیں ۔ ادص ؛ جن کی صحت کی جائے تو الفاظ یہ ہوں گے "ضد ۔ زاد ، ہم ۔ ہے ۔ یہ ۔ بالغیب ۔ چلتے ۔ یقین ۔ ادر" باقی رہا غیر مرتب الفاظ کی ترتیب دینا ، تو گھڑی ساز کی دوکان میں سیکڑوں پرزے منتشر رہتے ہیں وہ آناً فاناً ان سب کو ترتیب دے دیتا ہے اسی طرح ناظم جس کا پیشہ یہی ہے کہ خیالات کی منتشر فوج کو بروقت ترتیب دیا کرے ، اس کے لئے مشکل نہیں کہ چند منتشر الفاظ کو ترتیب دے کر ایک شعر نظم کرے ۔ پس طلبار کا امتحان اسی بات کا تھا کہ وہ فن عروض کی کنگھی سے اس زلف پریشاں کو سلجھا سکتے ہیں یا نہیں ۔ قہقہہ نے سب کام بگاڑ دیا ورنہ غیر مرتب الفاظ کو مناسب ترتیب دینے سے جو شعر ہوتا ہے وہ یہ ہے ؎

یہ کیا ضد ہے کہ بے دیکھے نہیں مانیں گے اس کو ہم
یقیں بالغیب رکھ کر کور مادر زاد چلتے ہیں

یعنی عجائب خانہ میں رکھنے کے قابل وہ بچہ ہے جو دونوں آنکھوں سے اندھا پیدا ہوا ہو ۔ کیونکہ اس کی زندگی کا ہر ورق گلستان سعدی سے زیادہ سبق آموز ہے ۔ ماں، باپ کی صورت ، زمین آسمان کی صورت ، اپنے مکان کی در و دیوار کی صورت ، بستی والوں کی صورت ، آگ مٹی اور پانی کی صورت آج تک اس نے دیکھی

نہیں۔ پھر بھی نادیدہ ہر شے کا اس کو یقین ہے آگ کو مٹی نہیں سمجھتا مٹی کو پانی نہیں سمجھتا۔ اور پانی کو آگ نہیں سمجھتا کبھی وہ عذر نہیں پیش کرتا کہ ماں کو ماں، باپ کو باپ کیوں مانیں، جبکہ آج تک ہم نے ان کو نہیں دیکھا ہے، سڑکوں پر نکلتا ہے تو اس کا ہر قدم بیقین بالغیب کا نتیجہ ہے۔ نشیب و فراز سے بچتا ہوا جاتا ہے اسلئے نہیں کہ نشیب و فراز آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اپنا عصا اور راستہ بتانے والوں کو وہ جھوٹا نہیں مانتا کسی نے ٹوک دیا کہ آگے کنواں ہے تو یہ سنتے ہی وہ اپنا رخ بدل دیتا ہے، حجت نہیں کرتا منطق نہیں شروع کر دیتا۔ پس ایک کور مادر زاد کی زندگی شاہد ہے اس بات کی کہ کسی چیز کا ماننا اس چیز کے دیکھنے پر منحصر نہیں ہے۔ ایک مریض کہتا ہے کہ میرے بدن میں درد ہے طبیب اس درد کو دیکھ نہیں سکتا۔ مگر نادیدہ پر یقین رکھتا ہے۔ اور درد کی دوا دیتا ہے اسی طرح سقراط، رستم، حاتم طائی، بابل و نینوا کے شاہی محلات، پانی پت کی لڑائیاں لیلیٰ مجنوں کا مکتب میں الف بے پڑھنا، بابر کا ہمایوں پر صدقے ہو کر مرجانا، ہارون رشید کا بھیس بدل کر راتوں کو نکلنا، سکندر کی تلوار خوں آشام، فرہاد کا تیشہ، بت شکن محمود کا نعرۂ اللہ اکبر، مدعی کی سرکوبی کرنے والا مچھر اور امیر علی ٹھگ کا رومال، یہ سب چیزیں، یہ سب لوگ، یہ سب مناظر، قبرستان ماضی میں آج مدفون ہیں، کوئی نہ ان کو دیکھتا ہے، نہ دیکھ سکتا ہے۔ مگر نادیدہ سب کو یقین ہے، کوئی یہ عذر پیش نہیں کرتا کہ پانی پت کی لڑائی اور فرہاد کا تیشہ جب میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا تو ہم ان کو مانیں کیوں؟ مگر ہاں جب خدا کے ماننے کی باری آتی ہے تو بنی اسرائیل، کفار مکہ اور دہریئے چیخ اٹھتے ہیں کہ واہ واہ جب اس کو دیکھا نہیں تو مانیں کیوں؟ مگر یاد رہے کہ کوہ طور پر صدا یہی آئی تھی کہ "لن ترانی"! اور کفار مکہ کو جواب یہی ملا تھا کہ ہم کو دیکھنا ہو تو "ہماری نشانیاں" دیکھ لو! خاک کو عالم پاک سے یا مخلوق کو خالق سے کوئی نسبت نہیں مگر یہ کیا ہے کہ مخفی زیب النساء کے نادیدہ عاشقوں نے جب اس کی زیارت چاہی تھی تو اس نے بھی صاف کہہ دیا تھا کہ "ہر کہ دیدن میل دارد، در سخن بیند مرا"!

۹۹۰ھ کا تاریخی واقعہ ہے کہ شہنشاہ اکبر جب کشمیر گیا تو وہاں شاہ عارف حسینی سے ملاقات ہوئی، شاہ عارف ہمیشہ نقاب پوش رہتا تھا اس لئے اکبر نے ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح گیلانی کو اس کی خدمت میں بھیجا، دونوں نے پہونچ کر

عرض کی "شاہا! کیا مضائقہ ہے۔ اگر نقاب اٹھا دو، ہم بھی تمہارا جمال دیکھ لیں" عارف حسینی نے نہ مانا اور کہا "ہم فقیر لوگ ہیں جانے دو، بہت مت ستاؤ" حکیم ابوالفتح گیلانی شوخ و بے باک تھا۔ ہاتھ بڑھا کر چاہا کہ نقاب کھینچ لے، شاہ عارف حسینی اس گستاخی پر جامہ سے باہر ہوگیا اور بولا: "میں مجذوم یا معیوب نہیں، لے دیکھ میرا منھ، مگر نتیجہ اسی دو ہفتہ میں دیکھ لے گا" یہ کہہ کر نقاب پھاڑ کر پھینک دیا۔ ابھی دو ہفتہ بھی نہ گزرے تھے کہ کشمیر سے واپسی میں ابوالفتح گیلانی درد شکم اور اسہال میں گرفتار ہوگیا، اکبر کا ماتھا ٹھنکا، شاہ عارف حسینی کا غصہ دھیما کرنے کے لئے کچھ روپے بھیجے کہ تبت کے محتاجوں میں تقسیم فرما دیجئے مگر یہ پیش بندی کچھ کام نہ آئی اور مرض اتنا بڑھا کہ ابوالفتح گیلانی نے راستہ ہی میں انتقال کیا تاریخ وفات نکلی تو یہ نکلی کہ "خدا ایش سزا داد ۹۹۷ھ"

پس جب زیب النساء اور شاہ عارف حسینی کے جیسے خاک نشینوں کا دماغ یہ تھا کہ اپنے تماشائیوں کو مستحق دیدار نہ سمجھا تو پھر جو ذاتی جان عالم ہے، بے نیاز ہے، یگانہ و یکتا ہے، جسم و مکان کے قیود سے مبرا ہے، ہر اول سے اول ہے، ہر آخر سے آخر ہے، "لم یلد ولم یولد" ہے، خود آ ہے وہ ہم خاک نشینوں کو مستحق دیدار کیوں سمجھے؟ اور سمجھے بھی تو یہاں طاقتِ دیدار کس میں ہے؟ اس لئے

طالب دیدار کی تنبیہ کے لئے دنیا میں کور مادر زاد بھیج دیا گیا، کیونکہ اس کی زندگی کی پوری عمارت صرف ایمان بالغیب پر کھڑی ہے اور عمارت زندہ گواہ ہے اس بات کی کہ بغیر دیکھے ہوئے کسی شے کو کیونکر مانا جا سکتا ہے! اگر خدا کا ماننا اس کے دیکھنے پر منحصر ہوتا تو دنیا میں جتنے اندھے ہیں ان کو معافی کا پروانہ مل جاتا، وہ یہ منطق پیش کرتے کہ ساری دنیا خدا کو مان رہی ہے تو آنکھ سے دیکھ کر مانتی ہے ہمارے پاس جب آنکھ ہی نہیں تو ہم کیونکر دیکھیں اور کیونکر مانیں؟ اس منطقی عذر سے بچنے کے لئے اگر خدا ساری دنیا کو آنکھیں دے دیتا یعنی کسی کو اندھا نہ پیدا کرتا، اور خود اپنے آپ کو فضائے آسمانی میں چاند سورج کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے معلق کر دیتا تاکہ ساری دنیا ہر وقت اس کو دیکھتی رہے اور انکار کا موقع کسی کو نہ ہونے پائے تو بھی ان تمام لوگوں کو معافی کا پروانہ مل جاتا جو کور مادر زاد نہ تھے، مگر بعد میں چوٹ کھا کر یا امراض کی وجہ سے یا بڑھاپے میں اندھے ہو گئے۔ ان میں سے ہر شخص یہ اعلان کر دیتا کہ کل تک ہم خدا کو دیکھتے تھے اس لئے مانتے تھے آج

دیکھ نہیں سکتے اس لئے مان نہیں سکتے۔

اب سوال یہ ہے کہ خدا کو ہم دیکھنا بھی چاہیں تو کس طرح دیکھیں؟ رنج راحت، سردی، گرمی، نیکی بدی، وقت، روح، درد، غصہ، رحم، ستم کی شکل و صورت آج تک کس نے دیکھی ہے؟ صرف آثار و نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ جو مچھلی جال میں تڑپ رہی ہے اس میں ابھی روح ہے۔ اور جو تڑپ کر سرد ہو چکی ہے اس میں اب روح نہیں ہے، مگر روح بذاتِ خود کیا ہے، یہ انسانی آنکھوں نے آج تک نہیں دیکھا جب روح کی لطافت و نزاکت یہ ہے تو روح کا پیدا کرنے والا اپنے کو دکھاتا تو کس طرح دکھاتا۔ اور ہم دیکھتے تو کس طرح دیکھتے؟ کیا ان آنکھوں سے جو نیر کے سامنے جھپک جاتی ہیں؟ کیا ان آنکھوں سے جو مہر نیمروز کے سامنے خیرہ ہو جاتی ہیں؟ کیا ان آنکھوں سے جو کوہِ طور پر ایک نظر غلط انداز تک سے شکست کھا گئیں؟ یہی جواب ہے میرا تیرے اس سوال کا کہ اگر خدا تھا تو بنی اسرائیل کے سامنے کیوں نہ آیا اور اب بھی ہے تو میرے سامنے کیوں نہیں آتا ہے

جو دکھلائیں تو غش ہوں سب، نہ دکھلائیں تو منکر ہوں

وہ یکتائی ہے اپنے حسن کی خود ہاتھ ملتے ہیں

یہی وجہ ہے کہ آسمانی کتابوں نے اعلان کر دیا کہ چشم ظاہر خدا کو دیکھ نہیں سکتی، جس کو دیکھنے کی تمنا ہو وہ چشم باطن سے اس کو دیکھ لے حسرت دیدار پوری کیونکر ہو جب آلۂ دیدار ہی ناقص ہے۔ اس لئے مجبوراً اس آلہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے آلہ سے کام لینا ہو گا اور وہ دوسرا آلہ وہی چشم باطن اور گوش باطن ہے، جس کی طرف تمام الہامی کتابیں اشارہ کر رہی ہیں کہ کاتب کو دیکھنا ہو تو اس کا مکتوب دیکھ لو۔ مگر اس نابینائی کا کیا جواب ہے کہ دہریوں نے جب مکتوب دیکھا تو خبط ہو گئے اور خبطگی میں چلا اٹھے کہ بھائیو! یہ مکتوب سراسر ہذیان ہے، اور ایسے کاتب کو ماننا ہم لوگوں کی شان کے قطعی خلاف ہے جب پوچھا کہ ہذیان کیونکر ہے تو کہنے لگے کہ کاتب نے زہرہ بائی کو چشم غزالاں دیکر فاتح اور شریفان کو چشم کور دے کر مفتوح کیوں کیا؟ اور خانہ کعبہ کو ابرہہ کے جنگل سے بچانے کے لئے اگر ابابیلوں کی فوج کو بھیجنا ضروری تھا، تو وہی فوج ابو طاہر کی سرکوبی کے لئے کیوں نہ بھیجی گئی، جب وہ بیت اللہ کو تاراج

کر رہا تھا؟ مگر یاد رہے کہ سالانہ امتحان دینے والے طلبا بھی اردو کے پرچے کو ہذیان سمجھ کر قہقہہ مارتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، حالانکہ وہ سوال ہذیان نہ تھا بلکہ غلط املا اور غلط ترتیب قصداً تھی۔ قصداً اس لئے کہ ممتحن کو اسی بات کا امتحان لینا تھا کہ ان غلطیوں کو درست کر کے کون کون صحیح جواب دیتا ہے اور سوال کو ہذیان سمجھ کر کون کون اٹھ جاتا ہے۔ اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! یہ قفسِ دنیا بھی دارالامتحان ہے، اشرف المخلوقات کا امتحان ہو رہا ہے اوراقِ زمین و آسمان اور اس مجموعۂ منتشر کے تمامی مکتوبات امتحان کے سوالات ہیں اور ان سوالات میں بھی جا بجا املا کی غلطیاں اور الفاظ کی بے ترتیبی قصداً چھوڑ دی گئی ہیں، املا کی غلطیاں یہ ہیں کہ ممتحن نے کسی کو اندھا پیدا کیا، کسی کو گونگا بہرا، کسی کو اپاہج، کسی کو بونا، کسی کو دیوانہ، کسی کے ہاتھ گھٹنوں تک پہونچا دیئے، کسی کے ہونٹ الٹ دیئے، کسی کی ناک چپٹی کر دی، کسی کی گردن کوتاہ کر دی، اور کسی کے کان دراز کر دیئے۔

عمر خیام کہتا ہے کہ ماہِ صیام کے تمام ہونے پر جب اور لوگ عید کا چاند دیکھ رہے تھے، اس وقت ہم ایک کمہار کی دکان پر کھڑے تھے۔ سامنے طرح طرح کے مٹی کے پیالے سجے رکھے تھے، اتنے میں ایک پیالہ پوچھ بیٹھا کہ بھائیو! کوزہ کون ہے اور کوزہ گر کون ہے؟ دوسرے پیالے نے جواب دیا کہ خاموش! کیا تم سمجھتے ہو کہ کمہار نے کھیت روندی ہوئی مٹی گوندھ کر اپنی تمام صناعی اس پر صرف اس لئے صرف کی ہے کہ اس عجیب و غریب پیالہ کو توڑ کر پھر کھیت کی مٹی کر دے؟ ہرگز نہیں، — تیسرے پیالے نے کہا کہ "لاریب"، کوئی کیسا ہی شوریدہ مزاج ہو مگر یہ نہیں کرے گا کہ جس جام سے بادۂ عشرت پی چکا ہو اس جام کو دے پٹکے، تب کمہار پر اس بات کا شبہ کیوں ہے کہ جن پیالوں کو خود اپنا دل بہلانے کے لئے اس شوق و محبت سے وہ بنا چکا، انھیں پیالوں کو ابھی جھنجھلا کر وہ چکنا چور کر دے گا۔ یہ سن کر اور پیالے تو خاموش ہو گئے مگر ایک بدصورت پیالہ بول اٹھا کہ "بھائیو! تم لوگ خوبصورت ہو تمہارے گاہک ایک نہیں ایک لاکھ، مگر ہم ایسے بھونڈوں کو کون پوچھے، دنیا ہم پر ہنستی ہے، خدارا بتاؤ کہ ہم کو بناتے وقت کیا کمہار کے ہاتھ میں رعشہ تھا؟ اگر کمہار کا ہاتھ اس وقت ٹھہرا نہیں تھا تو ہم بدصورت کیوں ہو گئے؟ کمہار کی

دوکان میں جو بحث چھڑی اس کا جواب امیر مینائی یوں دیتا ہے ؎

شبیہ مد نظر ہے کس کی؟ کہ کوئی صورت نہیں اترتی

مٹا دیے صانع ازل نے ہزاروں نقشے بنا بنا کر

یعنی روز آفرینش سے آج تک اتنی تصویریں جو خاک میں ملائی گئیں۔
اس کا راز یہ ہے کہ مصور کی مرضی کے مطابق آج تک کوئی تصویر اتری ہی نہیں
مصور غریب ابھی مشق کر رہا ہے، ہر صبح قلم ہاتھ میں لیتا ہے اور ہر شام کاغذ
کو جھنجھلا کر پھاڑ دیتا ہے۔ عمر خیام کی یہ رندانہ جرأت کہ پیالہ جب ٹیڑھا کبڑا
ہے تو ضرور کمہار کے ہاتھوں میں رعشہ تھا اور امیر مینائی کی یہ شاعرانہ جرأت کہ یہ
تصویریں جب ہر صبح و شام پھاڑ کر پھینکی جا رہی ہیں تو ضرور مصور اپنے فن میں
ابھی کچا ہے۔ یہ دونوں شان ایزدی میں سراسر گستاخیاں ہیں کیونکہ بھول چوک
ہاتھ کانپ جانا، خیال بٹ جانا، تصویر ٹھیک نہ اترنا، ان الفاظ کا اطلاق
صاحب کن فیکون کی ذات پر ہو ہی نہیں سکتا۔

دہد نطفہ را صورتے چوں پری — کہ کردہ است بر آب صورت گری

پس تصویر اگر بھونڈی ہے اور پیالہ اگر ٹیڑھا ہے۔ تو قصداً ٹیڑھا ہے،
قصداً اس لئے کہ مصوّر اور کمہار کو امتحان لینا منظور ہے۔ زہرہ بائی کی
طرح شریفن کو بھی وہ چشمِ غزالاں دے سکتا تھا، مگر قصداً نہیں دیں، تاکہ
اسی کے ذریعہ سے فرزندانِ آدم کا امتحان ہو جائے چنانچہ اس امتحان
کے لئے جب شریفن و زہرہ بائی بیک وقت دنیا کے سامنے پیش ہوئیں
تو ظاہر پرست نے باعصمت کو ٹھکرا دیا اور فاحشہ کو گلے لگایا۔ ہرن کے
شکار کے پیچھے ایک اندھی کو کچل ڈالا۔ حالانکہ وہ اندھی فرزندانِ آدم کے
رحم و کرم کی زیادہ مستحق تھی بہ نسبت اس کے جو چشمِ غزالاں رکھتی تھی۔ اس
غلط املا کو کسی نے درست نہ کیا۔ آنکھ والوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ شریفن کی طرح
ہمیں اندھے پیدا کیے جاتے تو اس وقت کیا ہوتا، اور یہ کہ آنکھیں جب
ہم کو دی گئی ہیں تو اس شکرانۂ نعمت میں ہم کو دنیا کے تمام نابیناؤں پر
لطف و کرم کرنا چاہیے یا نہیں۔ فرزندانِ آدم نے جب نابینا شریفن کو ٹھکرایا
تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس خاص امتحان میں سب کے سب ناکام ہوئے
مگر خود شریفن کے امتحان کی جب باری آئی، یعنے اندھے ہونے کے جرم میں

جب کسی نے اس سے عقد نہ کیا تو اس وقت اس نے گمراہی پر فاقہ کو ترجیح دی۔ اور عصمت بیچ کر کبھی منہدی نہ لگائی ۔ " ان اللہ مع الصابرین"۔ اس لئے شریفن اس امتحان میں کامیاب رہی ۔ اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! اس دارالامتحان میں جتنے اپاہج، اندھے، لولے، لنگڑے، دیوانے اور بدصورت ہیں، سب کے سب امتحان کا ایک ذریعہ ہیں، جو اپاہج پیدا کئے گئے، ان کے صبر و تسلیم کا اور جو تندرست اور صاحب جمال پیدا کئے گئے ان کے لطف و کرم اور انکسار کا بیک وقت امتحان ہو رہا ہے۔ اس امتحان کی سرگذشت شیراز کا ایک طالب علم یوں بیان کرتا ہے: "ہرگز از دورِ زماں نہ نالیدہ ام و روئے از گردشِ ایام درہم نہ کشیدہ مگر وقتیکہ پایم برہنہ بود۔ و استطاعت پاپوشی نداشتم بہ جامع کوفہ در آمدم دل تنگ یکے را دیدم کہ پائے نداشت سپاس نعمتِ حق بجای آوردم و بر بے کفشی صبر کردم"۔ ننگے پاؤں پھرنے کی شکایت کیوں کی جائے جب اوروں کے پاس پاؤں ہی نہیں۔ مگر اسی آزمائش میں فرزندانِ آدم کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں۔ "آوردہ اند کہ فقیہے دختر داشت بہ غایت زشت رو۔ بجائے زنان رسیدہ با وجود جہاز و نعمت، کسے در مناکحت او رغبت نمی کرد فی الجملہ بہ حکمِ ضرورت با ضریرے (نابینائے) عقد نکاحش بستند و آوردہ اند کہ حکیمے در آں تاریخ از سراندیپ آمدہ بود کہ دیدۂ نابینا را روشن ہمی کرد۔ فقیہہ را گفتند چرا دامادِ خود را علاج نہ کنی؟ گفت ترسم کہ بینا شود دخترم را طلاق دہد!"۔ اس فقیہہ کو تجربہ ہو چکا تھا کہ لڑکی سن بلوغ سے کوسوں آگے بڑھ گئی۔ مگر بدصورتی کے جرم میں دنیا نے اس کو پوچھا نہیں خدا خدا کر کے ایک نابینا داماد ملا تو وہ داماد کہاں کا ایسا خدا ترس و خدا شناس تھا کہ آنکھیں پا کر اپنی منکوحہ سے وہی سلوک نہ کرتا جو آنکھ والی دنیا کر چکی ہے۔ اس لئے اندھے داماد کو زندگی بھر اندھا ہی رکھنا خوب تھا۔

الغرض جس طرح املا کی غلطیاں قصداً ہیں۔ اسی طرح الفاظ کی بے ترتیبی بھی قصداً ہے ممتحن نے اپنے سوالات میں الفاظ کی بے ترتیبی یہ رکھی ہے کہ ابرہہ کی شکست کے لئے ابابیلیں بھیجیں مگر ابوطاہر کو سنگِ اسود اکھاڑنے دیا جناب عیسیٰؑ ابنِ مریم کو طمانچے کھانے کے لئے خاتم النبیینؐ کو کانٹوں پر چلنے کے لئے اور امام الصابرین حسینؑ ابن علیؑ کو ریگ تفتہ پر ذبح ہونے

کے لیے چھوڑ دیا، مگر فراعنۂ مصر کو صدیوں تک مصر کی حکمرانی نصیب فرمائی
ایک بچہ کو بادشاہ کے گھر پیدا کیا دوسرے کو فقیر کے گھر میں، ایک کو متقی
کے گھر میں، دوسرے کو ٹھگ کے گھر میں، ایک کو طوفان کی زد سے بچا لیا،
اور دوسرے کو شفاء الملک کی گود سے چھین لیا۔

حسن ز بصرہ، بلال از حبش، صہیب از روم ز خاکِ مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است

مگر اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! بساط شطرنج پر مہروں کی
ترتیب صرف کھیل کے پہلے درست رہتی ہے، کھیلتے وقت وہ ترتیب کہاں؟
بازی جس وقت شروع ہوگئی اس وقت پیادوں کی قطار اور شاہ کے
مصاحبین یمین و یسار کی صف بندی ناممکن ہے۔ کھیل کے وقت فرزیں
کے دامنے کبھی پیادہ ہے اور کبھی رُخ۔ رُخ کے بائیں کبھی پیل ہے اور کبھی اسپ
اور اسپ کبھی بازی کو زیر و زبر کر رہا ہے اور کبھی خود شہ کی خدمت میں
پیش ہو گیا۔ اسی طرح "انی جاعل فی الارض خلیفہ" کے اعلان کے بعد جب
بساطِ کونین پر مہرے چلنے شروع ہو گئے تو اب وہ اگلی ترتیب و صف بندی
کیونکر قائم رہتی؟ شجرِ ممنوعہ والی جنت میں ہرگز ایسا نہ تھا کہ ایک اپاہج و نابینا
ہو اور دوسرا تندرست و توانا۔ ایک گدائے فاقہ کش ہو اور دوسرا صاحب
تاج و تخت۔ ایک اسمٰعیل ذبیح ہو اور دوسرا ہلاکو خاں۔ اس جنت میں
جو تھے وہ ہم پایہ و ہم سنگ تھے؛ مگر ہاں جس دن وہ جنت چھن گئی اور
مشیت ایزدی نے آدم و حوا کو دارالامتحان میں بھیج دیا اسی دن سے وہ تمام
بے ترتیبیاں قصداً شروع کر دی گئیں جو آزمائش کے لئے ضروری سمجھی گئیں
کہ اجتماع ضدین اور بے ترتیبی آزمائش کیلئے نہیں ہے تو فرعون کی داڑھی جب اسکے
متبنیٰ (حضرت موسیٰ) نے نوچی تھی اور اس نوچنے پر اسکو شبہ ہوا تھا کہ یہ بچہ کہیں وہی
تو نہیں ہے جس کے بارے میں نجومیوں نے خبر دی تھی کہ میرا خاتمہ کر دے گا،
اور اس لئے جب فرعون نے اس بچہ کا امتحان لینا چاہا تو اس نے ایک
تھالی میں آتشیں لعل اور دوسری تھالی میں جلتے ہوئے انگارے اس بچہ
کے سامنے کیوں رکھے تھے۔ یقیناً اسی آزمائش کے لئے رکھے تھے کہ بچہ اگر
فہمیدہ ہے تو انگاروں کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے گا۔ اور اگر واقعی نا سمجھ ہے

تو انگاروں کو ہاتھ میں لے لے گا۔ اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے، پھر یہ کیا ہے کہ اس دارالامتحان میں اجتماعِ ضدین کو دیکھ کر تو چیخ اٹھتا ہے کہ اگر خدا ہوتا تو اس قسم کی بدنظمی کیوں ہونے پاتی؟ تیری باتیں ملک الشعراء سے ملتی جلتی ہیں جو ایک مرتبہ خود مرضِ چشم میں گرفتار ہوا تو عرق کی چند بوتلیں لے کر دوکان کھول بیٹھا اور تختی لٹکا دی کہ "یہاں آنکھوں کا علاج ہوتا ہے قیمت فی شیشی ایک آنہ" اتفاقاً ایک پردیسی مریض اس دواخانہ میں داخل ہوا تو ملک الشعراء کی ابلی ہوئی خون کبوتر آنکھوں کو دیکھ کر اس نے ایک شیشی عرق کے لئے دو آنے پیسے دیئے۔ ملک الشعراء نے جھنجھلا کر کہا، کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ ایک شیشی عرق کی قیمت صرف ایک آنہ ہے؟ خریدار نے جواب دیا "کہ ایک آنہ زائد اس لئے ہے کہ حضور بھی اپنی دکان سے ایک شیشی خرید لیں اور اپنی آنکھوں کا علاج کر لیں گے۔ معلوم نہیں ملک الشعراء نے اس ایک آنہ پیسہ سے اپنی آنکھوں کا علاج کیا یا نہیں۔ منطق یہ پیش ہوتی ہے کہ خدا ہوتا تو سامنے ضرور آتا، جب کہا گیا کہ سامنے آنے کی وہ چیز نہیں اور تم حضوری کے قابل نہیں تو عذر یہ ہے کہ بغیر دیکھے ہوئے کیونکر مانیں جب یہ کہا گیا کہ نقشِ پا دیکھ کر پہچان لو تو کہنے لگے کہ ہر نقش نقشِ بر آب ہے فرضی ہے موہوم ہے، الٹا سیدھا ہے، بالکل بے ربط ہے۔ یہ کیا کہ حضرتِ عیسیٰؑ طمانچے کھائیں اور فرعونی کتنے تختِ مصر پر لوٹیں؟

کلمہ گویوں کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی بے ترتیبی و بے ربطی قصداً ہے کیونکہ انکارِ سجدہ کے بعد سے جب شیطان اسی دھن میں ہے کہ آج رشوت دے کر فرزندانِ آدم کو کسی طرح اپنا کر لو، تاکہ کل یہ کہنے میں آئے کہ ایسے کم ظرفوں کو سجدہ نہ کرنا ہی خوب تھا تو ایسی حالت میں مشیت ایزدی نے بھی یہی چاہا کہ فرزندانِ آدم شیطان کی رشوت قبول کرنے نہ کرنے کا فیصلہ خود ہی کر لیں نسلِ آدم اپنے اعمال و افعال میں خود مختار چھوڑ دی گئی ہے پرندوں کی طرح، ہم فضائے آسمانی میں اڑ نہیں سکتے مگر دارالامتحان کی سرزمین پر جس طرف چاہیں جا سکتے ہیں۔ اور خانۂ دل میں جس قسم کے خیالات کو جگہ دینا چاہیں دے سکتے ہیں اگر نسلِ آدم اپنے افعال میں مجبور کی جاتی تو پھر میزانِ محشر اور تخلیق بہشت و دوزخ کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ مجبوروں سے

باز پرس کرنا صریح ظلم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ لڑکے جو سنِ تمیز کو نہ پہنچے ہوں یا وہ لوگ جو اپنے حواس میں نہ ہوں قیود مذہب سے آزاد کر دیئے گئے ہیں ان کے علاوہ ہر شخص اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہے کیونکہ ہر شخص آزاد ہے اس دارالامتحان میں دیر و حرم کے دروازوں پر ایک ایک تختی لٹکی ہوئی ہے دیر کی تختی پر باب جہنم کندہ ہے، راستہ چلنے والوں کے پاؤں بالکل آزاد کر دیئے گئے ہیں، کسی کے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ہیں جس کو جس طرف جانا ہو جا سکتا ہے مگر کس طرف جانا چاہیے اس کا اشتہار ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ عرش نشیں کی سرکار سے ہزاروں قاصد زبانی اور تحریری پیام لا چکے ہیں۔ گلی گلی منادی کر دی گئی ہے اس اعلان کے بعد بھی ابوجہل حرم کو چھوڑ کر دیر کی طرف جائے تو اس کی ذمہ داری خود ابوجہل پر ہے نہ کہ اللہ یا اس کے رسولوں پر۔ دہریوں کا اعتراض ہے کہ ابوجہل اگر دیر کی طرف جا رہا تھا تو اللہ میاں نے اپنے بندے کو شیطان کے پنجے سے زبردستی چھڑا کیوں نہیں لیا۔ گلہ بان کیسا ہے کہ بکریاں نہر کی طرف جا رہی ہیں اور وہ لاٹھی کے زور سے بکریوں کو روکتا نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پسر نوح کو اگر گود میں اٹھا کر زبردستی کشتیٔ نوح پر بٹھلا دیا جاتا تو پھر امتحان امتحان نہیں باقی رہتا۔ امتحان لینے والے کو یہی تو دیکھنا مقصود ہے کہ کون کون برضا و رغبت اس کی طرف آتا ہے اور کون کون دیدہ و دانستہ ابلیس کی طرف جاتا ہے۔ لا اکراہ فی الدین۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اتمام حجت کے لئے بہ تکرار آواز دی کہ بیٹا! میری کشتی پر اب بھی چلا آ، شیطان کی رفاقت مت لے مگر بیٹے نے کشتی پر آنے سے جب قطعی انکار کر دیا تو حضرت نوح علیہ السلام نے بھی خموشی اختیار کر لی حضرت نوح اس وقت سرکاری کام میں تھے سرکاری حکم یہی تھا کہ جو شخص اپنی خوشی سے تمہاری کشتی پر نہ آئے اس کو زبردستی مت بٹھلانا اگر یہ حکم نہ دیا جاتا اور پسر نوح کو شیطان کے پنجے سے چھڑا کر جبراً کشتی میں سوار کر دیا جاتا تو پھر عبدیت و بغاوت میں کوئی امتیاز باقی نہ رہتا۔ دودھ میں مکھی پڑ جاتی اور معصومیت کو معصیت کے ساتھ پہلو بہ پہلو بیٹھنا پڑتا، امتحان کے وقت جبر و تشدد ہو نہیں سکتا۔ اگر ہو سکتا ہے تو شداد ابن عاد جس وقت معماروں سے اوّل اوّل باغِ ارم کی فرمائش کر رہا تھا، اسی وقت

سے جبریہ توبہ کرائی جاتی، یا فوراً روح قبض کرلی جاتی، مگر ان دونوں صورتوں میں امتحان ادھورا رہ جاتا۔ جبریہ توبہ سے امتحان کی اصل وغایت اس لئے فوت ہوتی کہ بہت فرق ہے اس کتے میں جو اپنے مالک کی آہٹ پا کر خود بخود اس کے پاس دوڑا جاتا ہے اور اس بکری میں جو لاٹھی اور گلے کی رسّی کے زور سے قصاب کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ اور فوری قبضِ روح کا حکم دیا جاتا تو دنیا شکایت کرتی کہ باغِ ارم کا تعمیر کرنا اور چیز ہے غریب شداد نے اپنے خیال پر ابھی عمل کہاں کیا تھا کہ اس کی روح قبض کرلی گئی یہی وجہ تھی کہ شداد نے اپنے کفرانِ نعمت کی اور ہمارے اللہ نے اپنے امتحان کی جب تک تکمیل نہ کرلی اس وقت تک قبضِ روح کا حکم نہیں دیا گیا ان دونوں باتوں کی تکمیل اس وقت ہوئی جب خدائی کا دعویٰ کرنے والا شداد باغِ ارم کے دروازے میں داخل ہو رہا تھا

اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! ہمارے خدا نے شداد کو طوفان کی گود سے بچا کر اور سیٹھ کروڑی چند کے نوزائیدہ کو شفاء الملک کی گود سے چھین کر دہریوں کے منہ پر دو طمانچے لگائے ہیں۔ کیا بات تھی کہ شفاء الملک کا علم سینہ و سفینہ اور سیٹھ کا گنج فراواں جسم و روح میں وصلِ قدیم نہ رکھ سکا "شہید ان لا الٰہ الا اللہ"! قادرِ مطلق کی قدرت کا نظارہ جس کو کرنا ہو وہ اوّل کی بقا اور ثانی کی فنا دیکھ لے، باقی رہا یہ اعتراض کہ ہمارا اللہ جب رحیم ہے تو لاولد سیٹھ کے جگر میں ناسور کیوں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ "گندم از گندم بروید جو ز جو" سیٹھ کہتا پھرتا ہے کہ میرے دھرم میں جیو مارنا اس قدر پاپ ہے کہ کھٹمل بھی ہم کو کاٹے تو ہم اس کو ماریں نہیں بلکہ اٹھا کر باہر پھینک دیں کیونکہ اپنی زبان کے چٹخارے کے لئے بے زبانوں کا ذبح کرنا خاص مسلمانوں کی شان ہے مگر رحمدل سیٹھ کا دل دیکھنا ہو تو اس کا بہی کھاتہ دیکھ لو کہ کس طرح قتلِ عام ہو رہا ہے۔ دیکھ لو کہ سود در سود کی شمشیرِ بے نیام سے کس طرح ہزاروں لاکھوں کے سر قلم ہو رہے ہیں کس طرح یتیموں، بیواؤں، فاقہ کشوں اور دیگر قرض خواہوں کی قبریں کھود کر رحمدل سیٹھ ان قبروں پر جا بجا مندر اور دھرم شالے بنوا رہا ہے اور دیکھ لو کہ خود اپنے گھر میں چراغ جلانے کے لئے کس طرح وہ ایک جانشین کی تمنا کر رہا ہے ایسے مکّار قاتل کی سزا اگر یہ کی گئی کہ جانشین

گود میں بٹھلا کر چھین لیا گیا تو اس میں ظلم کیا ہوا؟ سیٹھ نے خلق اللہ پر ظلم کیا اور خلق اللہ کی آہ نے سیٹھ کی گود سے اس کا بچہ چھنوا لیا، کیونکہ اسی بچہ کے لیے سیٹھ دولت جمع کر رہا تھا۔

ہمارے اللہ کا قانون عدل و انتظام دیکھنا ہو تو دیکھ لو کہ مزدوروں اور فاقہ کشوں کے جھونپڑوں میں نعمتِ اولاد کی یہ فراوانی ہے کہ وہاں پاؤں پھیلا کر کوئی سو نہیں سکتا۔ اور اغنیا اور بادشاہوں کے محلات میں بچوں کا یہ قحط کہ جانشینی کے لیے زیادہ تر غیروں کے بچے گود لیے جاتے ہیں؛ یہ کیوں؟ اسلئے کہ غربت و امارت امتحان کا صرف ایک ذریعہ ہے یعنی جو غریب ہے اس کے صبر کا اور جو امیر ہے اس کے شکر کا بیک وقت امتحان ہو رہا ہے قارون کو گنج بے پایاں دیا گیا مگر اس نے احسان فراموشی کی اور اس لیے شداد کی طرح وہ بھی سزایاب ہوا۔ خاتم النبیین نے اپنی غربت و فاقہ کشی پر "الفقر فخری" کا اعلان کیا، اور اس کے لیے انعام میں "خیر البشر" کا تمغہ پایا۔ گندم از گندم بروید جو ز جو شیطان کی رشوت قبول کرنے کا فیصلہ ہر شخص خود کرتا ہے "لا اکراہ فی الدین" پس فراعنہ نے رشوت قبول کر لی۔ مگر جنابِ عیسیٰ نے خدا کی راہ میں خود طمانچے کھا کر شیطان کو طمانچے لگائے ہیں۔

اگر خدا جنابِ عیسیٰ کو طمانچے کھانے کے لیے حضرت خیر البشر کو کانٹوں پر چلنے کے لیے اور جنابِ سید الشہدا کو ریگِ تفتہ پر ذبح ہونے کے لیے چھوڑ نہ دیتا تو اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! آج دنیا کو کس طرح پتہ چلتا کہ فدائیوں کی شان کیا ہے اور شیطان کی رشوت کس کس نے قبول نہیں کی۔ اور ہمارا اللہ اپنے ہر فدائی کو حضرت ابراہیم کی طرح آتشِ نمرود سے حضرتِ موسیٰ کی طرح تعاقبِ فرعون سے اور حضرتِ عیسیٰ کی طرح صلیب جہود سے، اگر بچا لیتا تو شیطان اس وقت یقینی چیخ اٹھتا کہ واہ واہ تلوار کی جھنکار اور چیز ہے، تلوار کا گلے پر چلنا اور چیز ہے۔ ہر شخص جب حضرت اسمٰعیل کی طرح چھری سے بچا لیا گیا تو فرزندانِ آدم کے امتحان کی تکمیل کب اور کس پر ہوگی؟ پس فدائیانِ ماسبق کے امتحانات کی تکمیل جب ساحلِ فرات و دربارِ یزید و قیدخانہ دمشق میں ہو رہی تھی اس وقت تکمیل میں نقص

رہ جاتا اگر فوجِ الٰہی اور فوجِ ابلیس کی باہمی زور آزمائیوں میں تائیدِ الٰہی آکر ذرا بھی دخل دیدیتی۔ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تسلیم و رضا نماز و عبدیت دعوئے الفقر و فخری و طلاق دنیا یک قلم ناممکن العمل ہو جاتے۔ دار الامتحان میں پھر جو بھی آتا وہ یہی کہتا کہ علاؤ الدین کا چراغ ہمیں بھی مل جاتا تو ہم بھی رات بھر میں موتی محل تیار کر دیتے۔ مسلمانوں کے خدا نے بے شک اپنے ایک فدائی کو آتشِ نمرود سے بچالیا اور دوسرے فدائی کو شمشیرِ شمر کا شکار ہونے دیا تاکہ فرزندانِ آدم باغ ابراہیم کی سند پاکر وعدۂ باغِ جنت کو مشکوک نہ سمجھیں اور سر فروشیِ حسین کی سند پاکر تسلیم و رضا کو ناممکن العمل نہ سمجھیں، مگر یاد رہے کہ ان زبردست اسناد و نظائر کے ہوتے ہوئے جب یزید نے شیطان کی رشوت قبول کرلی۔ اور اصحابِ فیل کا انجام ہونے کے بعد بھی جب ابوطاہر نے بیت اللہ کو تاراج کیا تو اللہ نے بھی یزید و ابوطاہر کی جرأت، وہمت کی رسّی دراز کر دی ورنہ نمرود والا مچھر اور اصحابِ فیل والی ابابیلیں ہمارے اللہ کے پاس ہر وقت موجود ہیں۔ خود ابلیس کے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کیا گیا تھا چنانچہ بزمِ قدس سے نکلے جانے کے بعد وہ جہنم کی چہار دیواری میں محبوس نہیں کر دیا گیا بلکہ اس کی رسّی اتنی دراز کر دی گئی کہ بھیس بدل کر جنتِ آدم میں وہ باریاب بھی ہوا، شجرِ ممنوعہ کا راز بھی فاش کر سکا، اور اس دار الامتحان میں آدم و حوا کی تشریف آوری کے وقت سے اس کو اس کی بھی اجازت ہے کہ جب تک امتحان ہوتا رہے وہ نسلِ آدم کو رشوت دے کر یہ بھی مشاہدہ کرتا رہے کہ کون کتنے پانی میں ہے؟ —— زلیخا کے دستِ ہوس اور پائے ناز، چشمِ فسوں ساز و جبینِ نیاز، سنِ شباب و کمندِ التجا کی متحدہ زور آزمائیاں ایک طرف اور ایک پردیسی غلام کی "نہیں نہیں" دوسری طرف ؎

کیونکہ اس کی نگہ ناز سے جینا ہوگا ‌ ‌ ‌ ‌ زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

کاجل کی کوٹھری سے کورا نکل آنا اور قعرِ دریا میں تختہ بند ہونے کے بعد بھی دامن تر نہ کرنا۔ واقعہ یہ ہے کہ ماہِ کنعاں کی روحانی معراج تھی! اور اسی مشاہدے نے آشکارا کر دیا کہ مٹی اشرف المخلوقات کیوں گردانی گئی اور ملائکہ اس کے آگے سجدہ کرنے پر کیوں مجبور کئے گئے۔

کون کتنے پانی میں ہے؟ — سپہ سالار علی بیگ خاں لکھنوی

عباس ایرانی سے کہتا ہے کہ اس مرتبہ عشرۂ محرم میں ہم کو ایک یزید کی ضرورت ہے، تم کو قبول ہو تو دس ہزار کی تھیلی حاضر ہے۔ عباس ایرانی لکھنو کا ایک معمولی دکاندار۔ دو ہزار کا نام سن کر فوراً راضی ہو جاتا ہے۔ عشرۂ محرم شروع ہوتا ہے۔ لکھنو کا عشرہ اور وہ بھی شجاع الدولہ کے زمانہ کا: لاکھوں کا مجمع ہے جس میں عباس ایرانی کے بیسیوں بھائی بند اور روز کے ملنے والے بھی موجود ہیں۔ اتنے میں عباس ایرانی یزید کے بھیس میں آتا ہے اور سامان تو پہلے ہی سے موجود ہیں۔ عباس کے آتے ہی دربارِ دمشق کی سماں بندی شروع ہو جاتی ہے۔ دیکھو دیکھو وہ ناقے آ رہے ہیں۔ ناقوں پر فاقہ کش بیبیاں ہیں، سر ننگے ہیں، چادریں چھن چکی ہیں، ساحل فرات سے پیاسی آ رہی ہیں، تلواروں کے سایہ میں ہیں، ناقہ کی مہار ایک بیمار کے ہاتھ میں ہے۔ بیمار پاپیادہ ہے مگر پابہ زنجیر ہے۔ زنجیریں بھاری ہیں۔ جھنکار زنجیروں کی سنائی نہیں دیتی، ننھوں کی آواز سب پر بالا ہے، آج یوم العید ہے تماشائی گویا سیل دریا ہیں بلند نیزوں پر شہیدوں کے سر ہیں ایک نیزہ پر شباب الجنۃ (کے سردار) کا سر ہے۔ یہ سر تحفتاً دربار میں پیش ہوتا ہے، کس طرح پیش ہوتا ہے؟ ایک طشت میں۔ کہاں رکھا جاتا ہے؟ تاجدارِ دمشق کے پیروں کے پاس! تاجدار کیا کرتا ہے؟ بید کی چھڑی سے ٹھکراتا ہے؟ کس چیز کو ٹھکراتا ہے؟؟ لب ہائے شہیداں کو؟ کیوں ٹھکراتا ہے۔ تاکہ قبر مدینہ کی دیواریں ہٹ جائیں، کیوں ہٹ جائیں؟ اس لئے کہ صاحب قبر مطہر انہیں لبوں کے بوسے لیا کرتے تھے........

اس سماں بندی کے بعد اب ایرانیوں کو تاب کہاں ہر گوشے سے بکش بکش بزن بزن کے نعرے بلند ہوتے ہیں، بے خبری میں سینکڑوں تلواریں بے نیام ہوتی ہیں بجلی کی طرح یزید کے سر پر چمکتی ہیں مصنوعی یزید خود اپنے بھائی بندوں کو شمشیر بکف دیکھ کر چلاتا ہے۔ "ہاں ہاں میں یزید نہیں۔ تم لوگ پاگل ہوئے ہو، میں عباس ہوں عباس، شہید کربلا کا ماتم دار ہوں دشمن نہیں ٹھہرو ٹھہرو میں عباس ہوں۔ عباس، عبا........" مگر سینکڑوں تلواریں اس عباسی یزید کو چشم زدن میں قیمہ کر ڈالتی ہیں۔ اللہ رے!

یزید کی نحوست: جس کسی نے ایک گھنٹہ کے لیے بھی تفریحاً یزید بننا چاہا اس کو مزہ مل گیا کہ اس نام کی برکت کیا ہے۔

کون کتنے پانی میں ہے؟ — دمشق کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے لیے نمازی آ چکے ہیں خلیفہ ولید ثانی کی خدمت میں آدمی پر آدمی جاتے ہیں کہ یا امیر المومنین اب صرف آپ ہی کا انتظار ہے امیر المومنین جواب دیتے ہیں کہ چلو ہم فوراً آئے خدا خدا کر کے امیر المومنین مسجد میں تشریف لاتے ہیں ہزاروں نمازی صف بہ صف ایستادہ ہیں۔ امیر المومنین امامت شروع کرتے ہیں۔ امامت ختم ہوتی ہے اب نمازی مصافحہ کے لیے آگے بڑھتے ہیں؛ امیر المومنین کو کسی کی دل شکنی منظور نہیں امیر المومنین بھی اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھاتے ہیں۔ ایں! یہ ہاتھ تو واقعی چومنے کے قابل ہیں پنجۂ مرجان نحلی ہتھیلیاں، پتلی انگلیاں، نازک کلائیاں صاف بتا رہی ہیں کہ ہاتھ کسی زلیخا یا عیش بائی کے ہاتھ ہیں یہ حضرت امیر المومنین خود نیامدہ اند، اما برائے عزت افزائی بیت اللہ و تفریح نمازگزاراں، معشوقۂ خود را فرستادہ اند۔ نمازی اب سر پیٹ رہے ہیں۔ مگر سر پیٹنے سے کیا ہوتا ہے۔ امیر المومنین کی معشوقہ، امیر المومنین کے حکم سے، امیر المومنین کے بھیس میں آئی بھی اور نمازِ جمعہ پڑھا کر اب واپس بھی جا رہی ہے!

کون کتنے پانی میں ہے؟ — مہاراجہ شتاب رائے عظیم آباد کا نائب ناظم، ایک مرتبہ جنرل اسمتھ سے ملنے کے لیے باڑھ جاتا ہے باڑھ میں ایک مندر کی پشت پر خیمہ زن ہوتا ہے، مندر کے چالاک برہمن آکر خدمت میں کب حاضر ہوتے ہیں۔ جب شتاب رائے جنرل اسمتھ سے ملنے کے لیے پالکی میں بیٹھ رہا ہے، شگون کا وقت ہے۔ برہمن دست بستہ عرض کرتے ہیں۔ مہاراج! آنند، آنند! جہاں پر تم کھڑے ہو وہ جگہ مہا تیرتھ ہے، خود مہادیوجی کے چرن اس کو چھو چکے ہیں، آج پورنیما ہے، بچاریوں پر بھی مہاراج کی دیا ہو۔ شتاب رائے جواب دیتا ہے۔ "یہ باتیں تم اس سے کرنا جو یہاں تیرتھ کو آیا ہو، یا مندر میں درشن کا بھوکا ہو ہم کو تم سے یا تمھارے مندر سے کیا کام" یہ کہہ کر پالکی میں بیٹھ جاتا ہے اور کسی کو ایک کوڑی نہیں دیتا۔

مہاراجہ شتاب رائے جب کوئی نیا محل تعمیر کرتا ہے تو بھائی بند دست

احباب تقاضا کرتے ہیں کہ برہمنوں کو بھوج دے کر محل کی نیو اور اپنا محل مضبوط کر لو۔ شتاب رائے جواب دیتا ہے کہ گر جاں طلبی مضائقہ نیست۔ مگر اپنے مکان کو ہم نجس نہیں کر سکتے۔ برہمنوں کا بھوج دینا ایسا ہی فرض ہے تو گنگا کا کنارا موجود ہے۔ ردپے ہم سے لو۔ مہاراجہ شتاب رائے کا سخن تکیہ اٹھتے بیٹھتے " واللہ باللہ" ہے، ہر سال مشکل کشا کا دستر خوان چنتا ہے ماہ صیام میں شب ضربت آتی ہے تو کھیر اور مٹھائیوں پر فاتحہ دے کر تمام شہر میں تقسیم کرتا ہے۔ اور اپنے دونوں لڑکوں کا ختنہ کراتا ہے۔ اس کھلم کھلا بغاوت پر خاندان بھر میں کہرام مچتا ہے۔ تالیفِ قلب کے نسخے تجویز ہو رہے ہیں۔ مرلی دھر رائے، متل داس اور سر دسنگھ احباب خاص اصرار کرتے ہیں، کہ شہر میں ایک برہمن آیا ہوا ہے، رشی ہے، مہاتما ہے، درشن کے قابل ہے تم بھی چلو۔ شتاب رائے مجبوراً ساتھ ہو لیتا ہے۔ گرگ باراں دیدہ برہمن مہاراجہ شتاب رائے کو دیکھ کر اپنا وار یوں شروع کرتا ہے "مہاراج ہم نے تمہارا جنم پترا دیکھ کر یہ وچار کیا ہے، نام بہت سندر ہے، رات دن تم اسی نام کا مالا جپا کرو" شتاب رائے شیشہ کا جواب پتھر سے دیتا ہے، "جوگی مہاراج! اللہ کے ایک ہزار ایک نام ہیں انہیں ناموں میں سے ایک نام ہم اپنے لئے پہلے ہی بچار چکے ہیں" برہمن گھبرا کر پوچھتا ہے کہ آخر وہ کون سا نام ہے شتاب رائے کہتا ہے کہ وہ نام بتلانے کا نہیں۔ برہمن کہتا ہے کہ جب بتانے کا نہیں تو وہ جپنے کا بھی نہیں ہے۔ شتاب رائے کہتا ہے اچھا سنو، وہ نام رحیم ہے نبض شناس برہمن قہقہہ مار کر کہتا ہے۔ "مہاراج! رام اور رحیم تو ایک ہی پرماتما کے دو نام ہیں۔ شتاب رائے ہیرے کو ہیرے سے کاٹتا ہے "گروجی مہاراج! اب آگے نہ بڑھنا۔ رام کو رحیم سے کیا نسبت؟ رام کا نام سنتے ہی دسرتھ یاد آجاتا ہے، رام بیٹا اور دسرتھ باپ۔ مگر اللہ کے نام میں جھالر پھندنا کچھ بھی نہیں، اس نام میں کسی رشتہ ناتے کی بو تک نہیں"

کون کتنے پانی میں ہے؟ — پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم پڑھ کر مارے غصہ کے بھوت ہو رہے ہیں۔ پنڈت سے پوچھتے ہیں — ابے خیر تو ہے تیرے منہ سے حمد، نعت اور منقبت کیسی؟ اللہ رسولؐ پنجتن کے رشتے جوڑنے کے کیا معنی؟" پنڈت دیا شنکر آخر شاعر ہے، فی البدیہہ کہتا ہے!

مہاراج! اس میں چلیں یہ بجلیں ہونے کی کیا بات ہے؟ میری مثنوی کا مطلع پڑھیے ؎

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری   ثمرہ ہے قلم کا حمد باری

یعنی اپنے ہر کا نام ہم نے پہلے لے لیا تھا تب حمد باری شروع کی۔ برہمنوں کے ماتھے پر اب ایک شکن نہیں۔ سب خوش خوش گھر واپس جا رہے ہیں، مگر پنڈت دیا شنکر قلم ہاتھ میں لے کر اس کو یوں مخاطب کرتا ہے "ارے سنتا ہے۔ یہ رسائی فکر اور گلو خلاصی ثمر ہے حمد باری کا۔ اللہ کی حمد نہ کئے ہوتے تو اس وقت یقینی شہ مات تھی!"

کون کتنے پانی میں ہے؟ — شجاع الدولہ کو غسل میت دیا جا رہا ہے، غسل و کفن ہو چکا، اب جنازہ محل کے باہر آ گیا ہے۔ جنازہ کہاں جا رہا ہے، گلاب باغ جا رہا ہے، یہ باغ کہاں ہے؟ چار میل کے فاصلے پر جنازہ کے ساتھ کون کون ہیں؟ مرزا علی خاں اور سالار جنگ ہیں۔ وزرائے سلطنت اور مشاہیر فوج ہیں، شاہی خاندان اور متوسلین خاندان ہیں، غرض کہ فیض آباد کی ٹھیکری ہے، ہاتھی گھوڑوں کی قطار پیچھے ہے، کیا یہ سب لوگ چار میل تک پیدل ہی جائیں گے؟ دو میل کی مسافت طے ہو چکی۔ مگر دیکھو شانہ بدلنے کے لئے لوگ اب بھی ٹوٹے پڑ رہے ہیں، — ایں، یہ ماتم داروں کی صف چیرتے ہوئے کون بدتمیز چلے آ رہے ہیں؟ یہ بدتمیز قاصد ہیں مرزا امانی کے مرزا امانی کون؟ مرزا امانی عرف آصف الدولہ جس کا جنازہ جا رہا ہے اسی کا سپوت بیٹا۔ کیا آصف الدولہ اپنے باپ کے جنازے کے ساتھ نہیں ہے؟ ساتھ ہوتا تو ہرکارے کیوں بھیجتا، آخر ساتھ کیوں نہیں ہے؟ اپنی سعادت مندی کا ثبوت دے رہا ہے۔ ہرکارے کیوں بھیجے ہیں؛ مرزا علی خاں اور سالار جنگ کو پیام آیا ہے کہ جنازہ چھوڑ کر میرے پاس فوراً چلے آئیں، یہ دونوں آصف الدولہ کے کون ہیں؟ سگے ماموں ہیں! ماموں ہرکاروں سے کیا کہہ رہے ہیں؟ کہہ رہے ہیں کہ جنازہ جب تک گلاب باغ نہ پہونچ لے ہم کیونکر چھوڑیں اور چھوڑیں بھی تو خلق اللہ کیا کہے گی۔ ایں؟ اب یہ دوسرے ہرکارے صف ماتم کو چیرتے ہوئے کیوں آئے ہیں؟ یہ حکم لے کر آئے ہیں کہ دونوں ماموں اگر یوں نہ آئیں تو پکڑ کر لاؤ۔ تب؟ دونوں ماموں مجبوراً

جنازہ کو چھوڑ کر جا رہے ہیں اور خلق اللہ انگشت بدنداں ہے۔ ماموں بھانجے میں کیا گفتگو ہو رہی ہے؟ بھانجہ اپنے دونوں ماموں سے کہہ رہا ہے کہ باپ کا غم ہوتا رہے گا۔ پہلے آپ لوگ ہم کو جانشین قرار دے لیجئے۔ پھر ـــ پھر یہی کہ دونوں ماموں کانوں پر ہاتھ رکھ رہے ہیں کہ اتنی عجلت کیوں ہے؟۔ مگر بھانجہ کہتا ہے کہ واہ! نماز میت کے بعد ہی گلاب باغ میں اگر میرا چھوٹا بھائی مرزا سعادت علی جانشین قرار دے دیا گیا تو پھر ہم کیا کر لیں گے؟ تب! تب یہی کہ مرزا علی خاں سالار جنگ اور کرنل کلینس مجبوراً آصف الدولہ کے سر پر شاہی عمامہ باندھ رہے ہیں، فوجی باجہ تخت نشینی کا اعلان کر رہا ہے۔ جنازے کے ساتھ جتنے مشاہیر تھے سب دربار میں بلا لیے گئے ہیں۔ صرف غرباء و مساکین نماز میت کے لئے چھوڑ دیے گئے ہیں، اس طرف سپوت بیٹا مشاہیر سلطنت کی نذریں لے رہا ہے اور اس طرف باپ کی لاش پیوند خاک ہو رہی ہے، مرزا امانی عرف آصف الدولہ تخت اودھ پر بیٹھ کر کیا کرتا ہے؟ سب سے پہلا کام یہ کرتا ہے کہ اپنے پالکی بردار کہار کو "راجہ مہرا" کا خطاب دے کر امور سلطنت میں شریک کرتا ہے!

کون کتنے پانی میں ہے؟ ـــ جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی طرف سے میر مدن دھاوا کر رہا ہے اتنے میں ایک توپ کا گولہ آتا ہے اور میر مدن کی ران غائب۔ میر مدن کا انجام دیکھ کر سراج الدولہ اپنی ٹوپی میر جعفر خاں سپہ سالار کے پاؤں پر رکھتا ہے کہ اب میری جان اور آبرو تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میر جعفر خاں کہتا ہے کہ اب اس وقت تو شام ہوئی کل صبح دیکھا جائے گا۔ اب یہی گفتگو ہو رہی ہے کہ اتنے میں موہن لال سراج الدولہ کی طرف سے آگے بڑھ گیا۔ اس کو بڑھتا دیکھ کر میر جعفر خاں حکم دیتا ہے کہ ـــ "موہن لال بھاگ آؤ" سراج الدولہ میر جعفر کا منہ تکتا ہے۔ میر جعفر خاں جواب دیتا ہے کہ "حضور میری تو یہی رائے ہے۔ موہن لال کو بھاگتا دیکھ کر فوج کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ سراج الدولہ اب میدان میں بے یار و غمگسار اکیلا کھڑا ہے۔ افسران فوج کو حکم دیتا ہے کہ کم سے کم میری ذاتی حفاظت کیلئے محل میں پہرہ کا سامان کر دو۔ ایک سپاہی نہیں آتا۔ اس عالم میں تین بجے رات کو محل سے پوشیدہ فرار ہوتا ہے۔ بھگوان گولہ سے ہوتا ہوا نواب راج محل کے

دوسرے ساحل پر پہنچتا ہے۔ صرف ایک گھنٹہ کے لئے اترتا ہے کہ کھچڑی پکاکر تین دن کا فاقہ توڑے۔ تین برس کی بچی جو ساتھ ہے وہ بھی فاقہ سے ہے۔

سراج الدولہ چولہا سلگانے بیٹھتا ہے قریب میں شاہ دانا کا جھونپڑا ہے۔ شاہ دانا فاقہ کشوں کے پاس آتا ہے، دیکھ کر سر پیٹتا ہے۔ کہتا ہے کہ حضور فقیروں کا نان و نمک قبول ہو، نان و نمک حاضر کرنے کے لئے شاہ دانا اپنے جھونپڑے میں واپس جاتا ہے۔ وہاں پہنچ کر میر قاسم اور میر داؤد کو خفیہ خبر بھیجتا ہے — "جلد آؤ! تمہارا شکار اس وقت میرے دام میں ہے۔" شکاری پہونچتے ہیں — سراج الدولہ صید ہو کر مرشد آباد آتا ہے۔ دوپہر کا وقت ہے۔ میر جعفر خاں اب شاہ بنگالہ ہے۔ بھنگ کے نشہ میں بیہوش پڑا ہے اس کا بیٹا میرن حکم دیتا ہے کہ سراج الدولہ کو بغل کے کمرے میں بند کر دو پھر میرن اپنے مصاحبینِ خاص میں سے محمدی بیگ کو قیدی کے کمرے میں بھیجتا ہے

جلاد کے ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھ کر سراج الدولہ عرض کرتا ہے کہ وضو کے لئے تھوڑا سا پانی دیدو۔ "نمازِ توبہ" پڑھ لیں۔ محمدی بیگ توبہ کا دشمن ہے اس لئے پانی دینے سے انکار کرتا ہے۔ سراج الدولہ چلاتا ہے "پانی پانی! ایک گھونٹ پانی، خدا کی راہ میں" — شمر اس کی پیاس بجھاتا ہے مگر صرف آبِ شمشیر سے۔ سراج الدولہ اسی جاں کندنی میں درد دلوار سے کہتا ہے

بس ہم چلے! الفراق اے دنیا الفراق! آج حسین قلی خاں کا خون بے باق" جلاد اپنی شمشیر خوں آشام سے لاش کو پارچہ پارچہ کرتا ہے۔ میرن اس نعشِ صد پارہ کو ہاتھی پر رکھوا کر مرشد آباد کے بازاروں میں گشت کے لئے بھیجتا ہے فیل بان اپنی کسی ضرورت سے ہاتھی کو اتفاقیہ بازار میں ٹھہراتا ہے مگر ہاتھی جس دروازے کے سامنے اس وقت رُکتا ہے۔ وہ خدا کی شان کہ حسین قلی خاں کا دروازہ ہے۔ ہاتھی رکتا ہے اور نعشِ صد پارہ سے خون کے چند قطرے ٹھیک اسی جگہ پر گرتے ہیں جہاں آج سے دو برس پہلے شام کے وقت سراج الدولہ نے حسین قلی خاں کا خون بہایا تھا بیشک حسین قلی خاں کا خون آج بیباق ہو گیا۔ ہاتھی اب آگے بڑھتا ہے۔ اس محل سے گذرتا ہے جہاں سراج الدولہ کی ماں آمنہ بیگم ہے۔ کسی نے آمنہ بیگم سے کہہ دیا کہ "اے بی بی! تم کو بسنت کی کچھ خبر بھی ہے۔ جوان بیٹے کی لاش گشت

کے لئے جا رہی ہے۔ آمنہ بیگم چیخ مارتی ہوئی، ننگے پاؤں ننگے سر زنان خانہ سے بازار میں دوڑی آتی ہے۔ بیٹے کی لاش پر گر کر بلائیں لیتی ہے آمنہ بیگم کی فغاں اور سینہ کوبی سے بازار میں زلزلہ آگیا، خلقِ خدا ماتم کر رہی ہے۔ شقی القلب خادم حسین اپنی چھت سے یہ تماشہ دیکھ رہا ہے، اپنے عصا برداروں کو دوڑاتا ہے۔ عصا بردار بازار میں آتے ہیں اور آمنہ بیگم کو تھپڑ، گھونسے اور لاٹھیوں سے مار کر بیٹے کی لاش سے چھڑاتے ہیں۔ اب ہاتھی آگے بڑھتا ہے۔ اِدھر نعشِ صد پارہ گشت ہو رہی ہے اور اُدھر میر جعفر خاں بھنگ کے نشے سے ہوش میں آتا ہے، خبر ہوتی ہے کہ سراج الدولہ قید ہو کر آگیا میرن کو رقعہ لکھتا ہے کہ:۔ "بیٹا قیدی بھاگنے نہ پائے، خبردار"۔ میرن حاملِ رقعہ سے کہتا ہے کہ:۔ ابا جان سے کہہ دیجیو کہ آپ کا بیٹا آپ سے زیادہ تیز ہے۔ کون کتنے پانی میں ہے؟ — سراج الدولہ کے بعد اس کے چھوٹے بھائی مرزا مہدی کی باری آتی ہے۔ پندرہ برس کا لڑکا نہایت حسین، دو تختوں میں داب کر مار ڈالا جاتا ہے۔ اس کے بعد آمنہ بیگم اپنی بڑی بہن گھسیٹی بی بی کے ساتھ قید کر کے ڈھاکہ بھیجی جاتی ہے۔ جسارت خاں گورنر ڈھاکہ کو میرن خط بھیجتا ہے کہ ان دونوں کو وہیں دریا میں ڈبا دو۔ جسارت خاں جواب دیتا ہے کہ گورنری تو سات سلام، مگر یہ اندھیر ہم سے نہ ہوگا۔ تب میرن اس کو لکھتا ہے کہ اچھا حاملِ رقعہ کے ساتھ ان دونوں کو میرے پاس مرشد آباد بھیج دو۔ جسارت خاں دونوں کو حاملِ رقعہ کے ساتھ کر دیتا ہے، میرن کا قاصد دونوں کے ساتھ ناؤ پر سوار ہوتا ہے، جب ناؤ ایک سنسان مقام پر پہونچتی ہے تو قاصد کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ کیونکہ اب اس کو میرن کے پوشیدہ حکم کو بجا لانا ہے۔ کہتا ہے کہ:۔ بی بیو! آج تمام دن تم لوگوں نے کچھ کھایا نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ فاقہ شکنی کر لو اور اچھے کپڑے بدل لو کیونکہ یہ آخری سفر ہے — آخری سفر کا نام سن کر گھسیٹی بی بی اور آمنہ بیگم تھرا جاتی ہیں، پھر چھوٹی بہن سنبھل کر بڑی بہن سے کہتی ہے کہ:۔ سنو جی: موت سے ڈرنا کیسا، جو آتا ہے مرنے کے لئے آتا ہے عید مناؤ کہ اس خونِ ناحق سے ہم دونوں کے گناہوں کی گٹھری خود بخود میرن کے سر چلی جائے گی، موت کی موت، کفارہ کا کفارہ، اور انتقام کا انتقام ایسی موت

تو قسمتوں سے ملتی ہے۔ یہ کہہ کر دونوں بہنیں وضو کرتی ہیں۔ کفن کی جگہ اجلے کپڑے پہنتی ہیں۔ خاک شفا ملتی ہیں۔ دعائے توبہ پڑھتی ہیں۔ پھر میرن کے قاصد سے کہتی ہیں کہ۔۔ ہم دونوں اب تیار ہیں۔ بھیا! اب تم اپنا کام کرلو۔ قاصد ہچکچاتا ہے۔ یہ کہہ کر دونوں بہنیں ہاتھ پھیلا کر بہ آواز بلند توبہ مانگتی ہیں۔۔ کہ خدایا! اپنے گنہگار کنیزوں کی آواز سن، جس رکابی میں میرن آج کھا رہا ہے۔ وہ رکابی تیرے کنیزوں کی ہے۔ کنیزیں گنہگار ہیں تو تیری محسن کش ہیں۔ خاکِ شفا کو بوسہ دیتی ہیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر دریا میں کود پڑتی ہیں۔

کون کتنے پانی میں ہے؛۔۔۔ جس شب کو دریائی موجوں نے گھسیٹی بی بی اور آمنہ بیگم کو اپنے آغوش میں لیا۔ اسی شب کو تقریباً تین سو کوس کے فاصلے پر میرن اپنے مصاحبین خاص کے ساتھ دریا کے کنارے خیمہ زن ہے۔ شروع برسات ہے بادل کی گرج اور موسلا دھار پانی سے عاجز ہو کر گیارہ بجے رات کو اپنے بڑے خیمہ میں ایک مختصر دلگیر خانی خیمہ میں پناہ کیلئے آتا ہے۔ اس چھوٹے خیمہ میں آکر میرن ابھی پلنگ پر لیٹ ہی رہا تھا کہ اتنے میں بجلی خیمہ کو چیرتی ہوئی آتی ہے۔ اور اس کے سر پر گرتی ہے۔ اب دیکھا جاتا ہے تو پلنگ کے سرہانے پٹی جل کر راکھ ہو گئی ہے مگر خود میرن کا جسم راکھ نہیں ہے۔ بلکہ سر میں چھ سوراخ اور پیٹھ پر چھ سات کوڑوں کے نشان ہیں۔ اخفائے موت کے لئے یہ لاش صبح کو ہاتھی پر گشت کرائی جاتی ہے، وہ اس طور پر دونوں پاؤں ہودج سے باہر لٹک رہے ہیں تاکہ دیکھنے والے سمجھیں کہ میرن بیمار ہے اور سو رہا ہے مگر دیکھنے والے فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ بیمار نہیں مردہ ہے۔ اور یہ مردہ اسی کا ہے جس نے آج سے تین برس پہلے سراج الدولہ کی نعش صد پارہ ہاتھی پر گشت کرائی تھی۔ کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔

نیاز فتحپوری

خدا ہے یا نہیں؟

اس کا جواب سورج کے طلوع و غروب سے چاہو۔ چاند کے ایاب و ذہاب سے پوچھو، آبشاروں کی روانی اور دشت و صحرا سے دریافت کرو۔ پہاڑوں کے سکوت اور دریاؤں کے شور سے طلب کرو۔

موسموں کا باقاعدہ تغیر و تبدل، بہار و خزاں کا ظہور و خفا، نباتات کی بوقلمونی، وحوش و طیور کی طبیعی نیرنگی، نوع انسانی کے قوائے کامنہ، فضائے بسیط کے ستارے، کائنات کی لاانتہا وسعت، خورو شبنم، ذرہ و آفتاب اور ان سے بھی فروتر انسانی مساعی کی مختلف صورتیں جن کا نام ہم نے علم طبقات الارض علم الجو، علم الافلاک، علم الکیمیا، علم وظائف الاعضاء، علم الحیات، نفسیات وغیرہ رکھا ہے، بتائیں گی کہ کوئی ایسی قوت ہے جس کے سمجھنے کے لئے ہم اپنی عقل کو عاجز و بے بس پاتے ہیں۔ اور اسی لئے یہ مسئلہ اس قدر بدیہی، اس درجہ روشن و واضح ہے کہ اگر چاہوں تو اسے مشاہدہ سے تعبیر کر سکتا ہوں جس کے لئے نہ کسی دلیل و برہان کی ضرورت ہوتی ہے ۔۔۔ نہ کسی حجت و توجیہ کی۔

آفتاب طلوع ہوتا ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے آگاہ

ہوجاتا ہے صبح کو پھول کھلتے ہیں۔ اور سارا کنج نکہت سے معمور ہوجاتا ہے یہ وہ حقیقت ہے جو آپ اپنی برہان ہے، یہ وہ صداقت ہے جو آپ اپنی مصدق ہے۔ اگر ہم اس سے ناواقف ہیں تو کس کا قصور!

حق خامش ست و با تو بصد رنگ گفتگوست — شوق آرمیدہ است و فلک تار جستجو است
موقوف اضطراب بماں نیست عرض را — گردا رسی اشارۂ تحقیق مو بمو ست
ہر گہ نظر خطاب کند حرف خامشی است — ہر جا بہار ساز شود نغمہ رنگ و بو است
کثرت حجاب جلوہ وحدت نمی شود — مژگاں بہر چہ باز کنی دیدہ محو اوست

پھر اب نہ اور کبھی، یہ سوال تو پیدا ہی نہیں ہوا کہ کوئی قوت الادراک ہے یا نہیں، البتہ عقول انسانی کا اختلاف اس امر میں ضرور ہوا ہے کہ ہم اس کا تصور کیونکر کریں۔ اس نہ دیکھے جا سکنے والے کو کیونکر دیکھیں، اور اس نہ سمجھے جا سکنے والے کو کس طرح سمجھیں۔ فلسفہ آج تک اس گرہ کو نہ کھول سکا، مذہب کی عقدہ کشائیاں تمام تر اسی ایک معمہ سے وابستہ رہی اور مختلف زمانوں میں، مختلف انبیاء و رسل نے مختلف طریقوں سے اسی مسئلہ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا لیکن کیا یہ امر حیرتناک نہیں کہ باوجود اس کے کہ حقیقت ایک ہے مگر تعبیرات بے شمار، راز ایک ہے مگر اس کی داستانیں کثیر!

"حسنک واحد و عباراتنا شتیٰ"

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ — چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

مذاہب و نسک اور اقوام و ملل کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ کفر و اسلام، اذان و ناقوس کی جنگ جو آج نظر آرہی ہے کوئی نئی چیز نہیں۔ بلکہ اس کی ابتدا اسی وقت سے ہوتی ہے جب سے انسان اپنی فطرت سے جذبہ تفوق پرستی لے کر آیا ہے۔ یقیناً یہ جنگ علم و مذہب کی جنگ نہیں۔ کیونکہ اگر مذہب کا مقصود اعلیٰ صرف خداشناسی ہے تو پھر مجھے کوئی سمجھائے کہ دنیا کا کون سا علم ہے جو معناً اس غایت تک نہیں پہنچتا۔ نہیں بلکہ یہ جنگ ان رقیبوں کی تھی جو ایک ہی محبوب کے جلوے کے لئے بیتاب تھے، ان ہمہ دانان خود فراموش کی تھی جو سوا اپنے کسی اور کو "خلوتیانِ راز" میں شامل دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ یا زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہیے کہ وہ اپنے

ہی" ذوق سجود" کا تفوق ثابت کر کے آستانِ "محبوب" کو اپنے لئے مخصوص کر لینا چاہتے تھے۔ یقیناً یہ کمزوری کم و بیش ہر زمانہ کے انسان میں پائی گئی ہے۔ اور آج بھی تمام افتراق و انشقاق اسی کمزوری کا نتیجہ ہے۔

فلسفہ و استدلال کی دنیا میں آکر جب وقت اس مسئلہ پر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ اس کا اصل سبب صرف یہ ہے کہ خدا کے جس تصور کو مذاہبِ عالم نے پیش کیا وہ صحیح نہ تھا ممکن ہے کہ صرف قومی و ملکی نظام تمدن کے لحاظ سے اس وقت مناسب رہا ہو لیکن اخوت عامہ اور ہمہ گیری کے لحاظ سے وہ نامکمل تھا دنیا میں صرف ایک ہی مذہب ایسا ہوا ہے جس نے ہزاروں لاکھوں سال کی اس گتھی کو سلجھایا اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اب نہ مذہب کے لحاظ سے کسی اور مذہب کی ضرورت دنیا کو باقی ہے نہ مبلغ مذہب کی حیثیت سے کسی اور ہستی کے رونما ہونے کی حاجت ——— اور وہ مذہب اسلام ہے جو نہ کسی ملک کے لئے مخصوص ہے نہ کسی قوم کے لئے مختص، اس کی دعوت گبرو ترسا، یہود و نصاریٰ، عالم و جاہل، امیر و فقیر، شاہ و گدا، مشرق و مغرب، شمال و جنوب، ہر طبقہ اور ہر ملک کے لئے یکساں ہے، اور اسی لئے اس نے جو مفہوم خدا کی کبریائی کا پیش کیا ہے وہ ایسا جامع ایسا قرین عقل ایسا ہمہ گیر اور اس درجہ وسیع ہے کہ جس آسانی سے ایک جاہل اسے قبول کر سکتا ہے بالکل اسی طرح ایک فلسفی اسے ماننے پر مجبور ہے۔

وہ زمانہ جب "آسمانی بادشاہت" کا دعظ کہہ کر خدا کو ایک دنیاوی صاحبِ جبروت بادشاہ کی طرح پیش کیا جاتا تھا ختم ہو گیا۔ وہ عہد جب عقول انسانی صرف مرئی و محسوس اشیاء پر ایمان لا سکتے تھے، اور جب ضرورتاً اور مصلحتاً مسیح کو خدا کی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت ہوئی تھی گذر گیا وہ دورِ انسانیت جب کہ مرکزِ نفس (CONCENTRATION OF MIND) کے لئے رمزی اور اشاری SYMBOLIC طریق عبادت محسوس کر کے خدا کے وجود کو بتوں، ہیکلوں، تمثالوں اور مجسموں میں تبدیل کیا گیا، باقی نہیں ہے، یہ تمام زمانے تقریباً ۱۳۵۰ سال قبل ختم ہو گئے۔ ریگستانِ عرب سے ایک انسانِ کامل و اکمل کا ظہور ہوا اور اس نے نہایت ہی مختصر و سادہ الفاظ میں خدا کے وجود کا وہ فلسفہ بیان کیا جو اس سے قبل کسی نے بیان نہ کیا تھا اس نے ثنویت و تثلیث کی تردید کی اس نے

تشتت و انتشار کی صورتوں کو محو کیا۔ تفریق و افتراق کی راہوں کو بند کیا۔ اور اس نے بتایا کہ خدا تمام مکانیات و زمانیات کے تعلق سے بے نیاز ہے مادیات کی دنیا سے علیحدہ ہے، اور ان نسبتوں اور اضافتوں سے منزہ جو عقل انسانی کو کسی وجود کے سمجھانے کے لئے متعین کی جاتی ہے۔

ایک طرف تو اس نے بتایا کہ اس کا قیام عرش بریں پر ہے یعنی ذات انسانی سے علیحدہ ذات میں فضائے وسیع اور جو لامتناہی ہیں جو کچھ ہے وہ سب اسی کا ہے۔ اور اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اور دوسری طرف اس کو شہ رگ سے زیادہ قریب بتایا یعنی جس حد تک ذاتِ انسانی کا تعلق ہے اس کے قرب کی کوئی انتہا نہیں، سانس میں جاری ہے خون میں ساری ہے روح میں دوڑ رہا ہے قلب میں جاگزیں ہے۔ اس کو رحمٰن و رحیم بتایا۔ اور جبار و قہار ظاہر کیا۔ بظاہر یہ نام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن یہیں سے یہ نکتہ حل ہوتا ہے کہ جن کو اسمائے حسنیٰ کہا جاتا ہے وہ نہ خدا کے ذاتی نام ہیں بلکہ اشاری و ظاہری اسماء ہیں جن کا تعلق کائنات کے ہر تغیر و تبدل زندگی کے تمام اصول اور ہستی کے جملہ اعتبارات و امتیازات سے ہے یعنی اگر انسان خوش و پرامن، زندگی بسر کر رہا تھا تو یہ بھی اسی کا مظہر ہے اور اگر قہر و جبر کی ساعتیں گزار رہا ہے تو یہ بھی اسی ایک ذات واحد کی وجہ سے ہے جس نے اسباب و علل پیدا کر کے عالم کی تمام کیفیات مادی و مذہبی کو اپنے سے منسوب کیا ہے اور جن کے اختیار کرنے اور انھیں کے مطابق نتائج حاصل کرنے کے لئے انسان کو عقل کامل عطا فرمائی ہے۔

یہ تھا خدا کا وہ تصور جو بانی اسلام نے بتایا اور دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے زیادہ پاکیزہ و منزہ خیال جو بالغ ترین نگاہ اور رسا ترین فکر انسانی کے لئے بھی قابل قبول ہو اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہی ہے وہ اصل اصول مذہب جو انسان کو وسیع النظر بناتا ہے۔ جو تمام افراد کو ایک رشتۂ اخوت سے وابستہ کرتا ہے اور جو دلوں کو تعصب و جہل کینہ و بغض سے پاک کرتا ہے لیکن کیا کوئی مسلمان آج کہہ سکتا ہے کہ وہ خدا کو ایسا ہی سمجھ رہا ہے جیسا بانی اسلام نے سمجھایا تھا اور اس کی آغوش ہر انسان کے لئے

خواہ وہ کسی بھی مذہب و ملت کسی قوم کا ہو۔ پوری طرح کھلی ہوئی ہے۔ یہاں تک
کہ طبقہ صوفیہ بھی جن کے مشرب و مسلک کا انحصار ہی عقیدہ "وحدت وجود"
پر ہے کوئی کیفیت اپنے ذہن و ضمیر میں اس نوع کی نہیں پاتے جو اس اعتقاد
کے بعد پیدا ہونی چاہیے۔

ہمارے ہاں کے علماء مقدس جو اپنی ساری زندگی صرف روزہ و
نماز کی تلقین میں بسر کر دیتے ہیں کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی غور نہیں کرتے کہ

کہ جس خدا کا پیام وہ دنیا کو پہنچا رہے ہیں وہ پہلے روزہ و نماز کا مطالبہ نہیں کرتا
بلکہ اس تعلق کی تصدیق چاہتا ہے جو اس کے اور بندوں کے درمیان قائم ہے
اور جس کو سمجھنے پر کائنات کی ترقی، روح کا استعلاء، اخلاق کی پاکیزگی، مادی
ارتقاء اور عالم کا امن و سکون منحصر ہے۔ اگر ایک مسلمان نماز پڑھنے کے بعد
مسجد سے یہ خیال لے کر نکلتا ہے کہ مندر و کلیسا خدا کی حکومت سے علیحدہ ہیں،
اگر وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھ کر اپنے سوا تمام عالم کو غیر خدا کی مخلوق جانتا ہے
تو مذہب معلوم اور اہل مذہب معلوم۔

پھر جب خدا سب کا ہے۔ تمام مخلوق اسی کی ہے۔ اس کو نہ مذہب سے
فائدہ پہنچتا ہے نہ لامذہبیت سے نقصان۔ تو پھر یہ عصبیت کیوں۔ یہ تفوق و برتری
کا غلط معیار کیا۔ طریق عبادت کے اختلاف پر جنگ کے کیا معنی وضع و لباس
کی تفریق تمدن و معاشرت کے امتیازات پر آویزش کیسی؟

دل چو آزاد از تعلق شد منور می شود   قطرہ گز موج" دامن چید گوہر می شود
یکس راہ محبت شرم ہم چشمی مباد   در ہوایت ہر کہ . . . . . . تری شود

انسانیت اب نہیں بلکہ طفولیت ہی سے حسن و جمال کا خواب دیکھ رہی
ہے اور جس حد تک ——— اس کا علم اور اس کے
مشاعر بڑھتے جاتے ہیں اسی قدر زیادہ شدت و تنوع کے
ساتھ یہ کیفیت بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک صاحب فن
اپنے فن میں۔ ایک شاعر اپنے شعر میں، ایک ادیب اپنی
انشا میں، ایک فیلسوف اپنے فلسفہ میں یہاں تک کہ ایک
مادہ پرست بھی جو اپنی فطرت کے لحاظ سے حسن کے مفہوم سمجھنے

کا بہت زیادہ نا اہل ہے، احسن ہی کا خواب دیکھتا ہے لیکن

جمال ایک خیال ہے جو مادہ کے ملبوس میں جلوہ گر ہوتا ہے وہ ایک تبسم ہے جو عالم انسانی کی پیشانی پر نمودار ہوتا ہے۔ وہ صحرائے حیات میں تھک جانے والے تمدن کی جائے پناہ ہے وہ ایک قوت ہے جو مادہ کی قیود سے ہمیں آزاد کرتی ہے۔ وہ حیات سے زیادہ ترقی یافتہ چیز ہے۔ جو حیات کو بھی بھلا دیتی ہے۔ ماں اپنی لڑکی کے سنہرے بالوں کے چھلوں کو دیکھ کر فرط مسرت سے مسکرا پڑتی ہے۔ اور لڑکی ہنس دیتی ہے۔ شاعر دیکھتا ہے اور ان دونوں کی ہنسی میں جمال الہٰی کی جھلک محسوس کرتا ہے۔ ایک نوجوان اپنی محبوبہ کے چہرے پر نگاہ ڈال کر اپنے قلب کو سکون سے بھر لیتا ہے۔ ایک شخص شام کے وقت آسمان کی رنگین فضا کو دیکھ کر آفتاب کو افق لانہایت میں غروب ہوتے ہوئے دیکھ کر جمال فطرت سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک شاعر مغنی حسن سے متاثر ہوکر اپنی موسیقی کے بازوں سے فضا میں اس تاثر کو پھیلا دیتا ہے۔ پھر اگر اس کا نغمہ عظمتِ وطن سے متعلق ہے تو وہ اپنے نفس کو وطن کے ہیکل مقدس پر قربان کرتا ہوا محسوس کرتا ہے اور اگر وہ نغمۂ محبت ہے تو ہر آواز کے ساتھ وہ اپنی روح کے اجزا کو صرف ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔

متارو (Tarde) اپنی کتاب "المنطق الاجتماعی (LOGIQUE SOCIALES) میں کہتا ہے ہم وطن کو جمیل کہتے ہیں جب وہ قوی ہوتا ہے اسے ہم عظیم کہتے ہیں۔

جب اس کے افراد مہذب و شائستہ ہوتے ہیں یقیناً جمیل ہے وہ وطن جو ظلم کے سامنے نہیں جھکتا اور جو لوا حضارت بلند کرنا اپنا نصب العین قرار دیتا ہے۔

اسپارٹا حسین تھا، جب اسپارٹا کا رہنے والا دیکھتا تھا کہ وہ بلاد یونان پر حکمراں تھا جب اہل مصر اپنے ملک کی

عظمت کے معتقد تھے۔ اور وہاں کے ہیاکل و آثار میں وہ انوار ربانی کی روشنی کو مرکوز پاتے تھے۔ روم جمیل تھا جب رومانی اپنی مملکت کو تمام بلاد عالم کی ملکہ جانتا تھا۔ بلاد عرب جمیل تھا جب اسلام اس کے فرزندوں کو حضارت مدنیت سے آراستہ کر رہا تھا۔ اور اس کی شوکت و جبروت کی داستانیں دنیا کے ہر گوشے میں سنی جاتی تھیں۔

یہ خیالات تھے ایک مصری ادیب کے جن میں رات میں محو تھا میں نے سوچا کہ سرزمین ہند بھی جمیل تھی جب کرشن کی تعلیم نے صحیح معنی میں حریت و آزادی کی روح گوشہ گوشہ میں پھونک رکھی تھی۔ لیکن اب وہی سرزمین شرق جو ہمیشہ سے طلوع حق و صداقت اور ظہور تہذیب و مدنیت کے لئے مشہور تھی سوگوار ہے کیونکہ اس کا حسن و جمال محو ہو گیا ہے اس کی عظمت مٹ چکی ہے۔ اور غالباً اس سے زیادہ دردناک داستان اور کوئی نہیں ہو سکتی ہے کہ یہ تمام سوگواریاں خود فرزندان ملک کے ہاتھوں اس کو حاصل ہوئی ہیں۔ کیا ہندستان کی تاریخ غلامی سوا اس بدبختی کے کسی اور چیز کی تاریخ تھی۔ کیا فرزندان آریہ ورت کہہ سکتے ہیں کہ ان میں وہی غیرت و حمیت وہی بلند خیالی اور عالی نظری پائی جاتی ہے جو ان کے اکابر و اعاظم میں پائی جاتی تھی۔ آج ہندوستان کی آبادی کا عنصر غالب غیر کی حکومت سے آزاد ہو چکا ہے ....

لیکن کبھی اس نے اس پر بھی غور کیا کہ وہ خود اپنے برادران وطن کے ساتھ کس سلوک و رواداری کو جائز رکھتا ہے۔ ہندوستان کے لئے آزادی اس کا فطری حق تھا جو اس نے حاصل کر لیا ....

.... لیکن وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے ملک کی اس آبادی کے جذبات کا خیال نہیں کرتے جس کے ضعیف شانوں کی مدد حاصل کئے بغیر یہ بار آسانی سے نہیں اٹھ سکتا!

آل احمد سرور

سرسید کی یاد میں

۱۷ اکتوبر سرسید کا جنم دن ہے۔ آج سے ایک سو اکتالیس سال پہلے وہ شیر دل اور جواں مرد رہنما، مصلح، مفکر اور معلم پیدا ہوا جس نے ہندستان کے مسلمانوں کی زندگی کا رخ بدل دیا اور انھیں افسردگی اور مایوسی کے غار سے نکال کر امید اور عمل کی شاہراہ پر لگا دیا۔ سرسید عہد ساز تھے اور عہد آفریں بھی۔ آج ہماری زندگی میں روشنی کی جتنی کرنیں اور یقین محکم اور عمل پیہم کی جتنی شمعیں ہیں وہ سب اسی سورج کی عطا کی ہوئی ہیں۔ سرسید نے بہت سے کام اپنے زمانے کی ضروریات کو دیکھ کر کئے، مگر ان کاموں میں جو خلوص، لگن اور دوراندیشی کی روح نظر آتی ہے وہ آج بھی ہمارے لئے باعث تقلید ہے۔ سرسید نے انتشار اور پراگندگی کا ایک محشر دیکھا، مگر عزم و عمل کی ایک بساط قائم کر دی، انھوں نے بڑے خواب دیکھے اور انھیں حقیقت بنانے میں لگے رہے، انھوں نے تصنیف و تالیف میں امتیاز حاصل کیا، سینکڑوں کو سماجی اور قومی احساس کی دولت عطا کی، ادارے قائم کئے، اسالیب بنائے اور تعلیم، ادب، مذہب، سیاست، معاشرت غرض ہماری زندگی کے ہر گوشے پر گہرے نقش چھوڑے۔ سرسید ہمارے ملک اور

قوم کے ان محسنوں میں سے ہیں جن کی یاد کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

سر سید نے مذہب میں عقلیت، معاشرت میں افادیت ادب میں مقصدیت، اور سیاست میں قومی ضرورت کو اپنا رہنما بنایا۔ آج بھی ان اصولوں کی اہمیت باقی رہتی ہے۔ انھوں نے چند بڑے کاموں کے لئے جس طرح اپنی زندگی وقف کر دی اس سے آج بھی ہم سبق لے سکتے ہیں۔ انھوں نے جس طرح دلنوازی اور دلداری کر کے کام کرنے والوں کا بڑا حلقہ اپنے گرد جمع کر لیا، اس کی تقلید آج بھی ہمارے لئے مفید ہے۔ انھوں نے جس طرح مخالفتوں اور مزاحمتوں کے باوجود اپنے مشن سے منہ نہ موڑا اسے آج بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ بونوں کے ہجوم میں ایک دیو پیکر شخصیت تھے۔ آج پھر ہمیں ایک ایسے ہی دیو پیکر شخص کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

سر سید نے اردو زبان کی حفاظت اپنی زندگی کے آخری لمحے تک کی۔ انھوں نے اردو ادب کو ایک طرف علمی نثر کے قابل بنایا، دوسری طرف اسلوب میں سادگی اور منطقی ترتیب پر زور دیا، تیسری طرف ادب کو زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ انھوں نے تحقیق کے اعلیٰ کارنامے پیش کئے، سنجیدہ خیالات کے دریا بہائے، معلومات کے خزانے لٹائے، اور طنز کے نشتر بھی لگائے۔ انھوں نے ایک پس ماندہ طبقے کو جدید زندگی کے قافلے میں شامل کر دیا اور اس طرح ملک کی ایک گراں قدر خدمت انجام دی۔ وہ فرقہ پرست نہ تھے، سچے محب وطن تھے، وہ زمانہ ساز نہ تھے زمانہ شناس تھے، وہ محض ایک شخص نہیں ایک ادارہ، ایک موج نہیں ایک طوفان تھے۔ ایسا طوفان جو زمین کو زرخیز بناتا ہے اور جس کے طفیل کھیت لہلہاتے ہیں۔ اور بستیاں جاگتی ہیں۔

ہم بہت جلد ہر یاد کو ایک رسم، ہر شخصیت کو ایک روایت ہر کارنامے کو ایک فسانہ بنا لیتے ہیں۔ ہم لوگوں کے عزم و عمل کی تقلید نہیں کرتے ان کے مزاروں کا طواف کرتے ہیں، ہم بزرگوں کا احترام کرتے ہیں ان سے محبت نہیں کرتے ہم بت شکنوں کے بت بنا لیتے ہیں، باغیوں کو ہیرو مان لیتے ہیں مگر ان کی چنگاری کو فراموش کر دیتے ہیں۔

سرسید نے ساری عمر قوم کی راہ میں سب کچھ لٹایا۔ ہم صرف مطالبہ کرنا جانتے ہیں، ہم سے بے لاگ خدمت نہیں ہوتی۔ ہم صبر نہیں کر سکتے، ذرا سی تکلیف پر چیخ اٹھتے ہیں، ہمیں خاموشی سے، استقلال سے، صبر اور سکون سے کام کرنا اور اس میں لگے رہنا نہیں آتا۔ ہم چمن کی بہار سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ مگر باغبانیِ صحرا کے آداب نہیں برت سکتے۔

سرسید کی زندگی، ان کا عظیم کارنامہ، اُن کا عزم اور اُن کا استقلال ہمارے سامنے ہے۔ کاش ہم سرسید کی یاد تازہ کرنے پر اکتفا نہ کریں، ان کی روح، ان کے نصب العین، ان کے خوابوں اور ان کے حوصلوں کی تقلید کریں، کاش سرسید کے ابدی کارنامے کی خاطر ہم ان کے وقتی کاموں پہ بھی تنقید کر سکیں۔ سرسید کا مطالعہ اور ان کی پیروی آج بھی ہمارے لئے نشہ اور نجات دونوں کا سامان بن سکتی ہے۔

---

(۳)

سرسید اس ادارے کے بانی ہی نہیں ہندستان کی ان عظیم شخصیتوں میں سے
ہیں جنہوں نے ہماری تاریخ پر ایک غیر فانی نقش چھوڑا ہے۔ سرسید نے زندگی کے
ہر شعبے پر اثر ڈالا۔ انھوں نے خواب دیکھے اور دکھائے اور پھر ان خوابوں کو حقیقت
بنانے میں لگے رہے۔ انھوں نے مذہب سیاست، تعلیم، معاشرت، ادب
صحافت سب میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ وہ بہت بڑے مصلح اور
مجدّد معلّم اور مجاہد تھے۔ انھوں نے اپنی ذہنی اور عملی قیادت سے قوم کا رُخ
مایوسی سے امید کی طرف سُستی اور بے عملی سے سعی اور جستجو کی طرف، ماضی کے نشے
سے حال کی ترشی کی طرف، ذاتی فلاح سے قومی بہبود کی طرف، رسم پرستی اور
اندھی تقلید سے حریت، فکر اور عقلیت کی طرف، اور قدیم اسالیب فکر سے جدید
عالمی معیاروں کی طرف پھیر دیا۔ اپنی پر سوز اور پر خلوص شخصیت کی وجہ سے
انھوں نے علم و ادب کے کتنے ہی آفتاب و ماہتاب اپنے گرد جمع کر لئے
اور مخلص، ہوش مند اور باعمل نوجوانوں کی ایک پوری نسل تیار کر دی یقین
محکم اور عمل پیہم کی وہ زندہ تصویر تھے۔ ان کی یاد کافی نہیں ان کی بلند پایہ
شخصیت اور گراں قدر کارناموں کا علم و عرفان ضروری ہے۔ اور آج

پہلے سے زیادہ ضروری ہے۔

سرسید ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے ان کا خاندان دہلی میں اپنی شرافت اور علم وفضل کے لحاظ سے ممتاز تھا۔ سرسید کی تعلیم دستور کے مطابق گھر پر شروع ہوئی۔ پہلے فارسی اور عربی پڑھی پھر ریاضی علم ہندسہ اور طب کا مطالعہ کیا۔ ان کے آبا و اجداد دہلی کے دربار میں ممتاز عہدوں پر فائز رہے تھے۔ مگر انھوں نے قانون کا مطالعہ کرکے منصفی کا امتحان پاس کیا۔ اور ۱۸۲۹ء میں منصف مقرر ہوئے۔ ملازمت کی مصروفیات کے باوجود مطالعے اور تصنیف وتالیف کے ذریعے اپنے ذہن پر جلا کرتے رہے دہلی کے قیام کے زمانہ میں انھوں نے وہاں کے مشہور علماء سے حدیث قرآن اور فقہ کے درس لئے وہیں انھیں دہلی کی تاریخی عمارتوں کا تذکرہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا بڑی محنت اور عرق ریزی کے بعد ۱۸۴۷ء میں آثار الصنادید شائع کی یہ ان کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے اور اس میں دہلی کی مختصر تاریخ وہاں کی مشہور عمارتوں محلوں حویلیوں اور کتبوں کی تفصیل اور ایک سو بیس (۱۲۰) اہل علم اور مشاہیر کا حال درج ہے۔ اس کے بعد انھوں نے آئین اکبری کے متعدد نسخے فراہم کرکے ایک مفصل مقدمے اور حواشی کے ساتھ اسے شائع کیا سرکاری کاموں کے باوجود علمی مشاغل میں اس انہماک نے ان میں ایک خاص بصیرت پیدا کردی جس کی وجہ سے بعد میں بڑے بڑے کام ظہور میں آئے۔

۱۸۵۷ء میں سرسید نے ایک طرف حکومت کو اس کے کام کے قائم کرنے میں مدد دی۔ دوسری طرف رفاہ عام کے ان سب کاموں پر توجہ کی جن کی وجہ سے پراگندہ روزی اور پراگندہ دل لوگ مطمئن ہوسکیں انھوں نے اپنی خدمات کا صلہ قبول نہ کیا اور اس زمانے میں جب اظہار خیال پہ مہر اور زبان پر تالے

تھے، غدر اور فسادات کی ذمہ داری حکومت کی بعض خرابیوں اور مذہبی مداخلت پر رکھی اور اہل ہند کی طرف سے کسی سازش کے الزام کو باطل ٹھہرایا۔ اسباب بغاوت ہند نہ صرف ان کی ہمت وجرات کا ثبوت ہے بلکہ ان کی بصیرت اور سوجھ بوجھ کی بھی روشن دلیل ہے۔

یہ دور ہندستانیوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً بڑی سختی کا تھا۔ انگریزوں

نے غدر کے بعد بڑا ظلم کیا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں عام طور پر ہراس اور سراسیمگی پھیل گئی تھی مگر سرسید کے استقلال میں فرق نہ آیا۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ نیا سیاسی نظام اپنے ساتھ بہت سی لعنتوں کے باوجود برکتیں بھی لایا ہے اور ان برکتوں کی طرف سے روگردانی کرنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی پستی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ قدیم نظام تعلیم کی فرسودہ قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ اور علوم مغربی اور جدید زندگی کی ضروریات سے غافل تھے اس لئے انھوں نے ۱۸۶۳ء میں "التماس بخدمت ساکنان ہندستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند" شائع کیا اور اس میں ایک سائنٹیفک سوسائٹی کے قیام کی تجویز پیش کی۔ اس سوسائٹی کا مقصد انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ پیش کرنا اور مغربی علوم کو ہندستان میں مقبول بنانا تھا۔ دہلی کالج کے بعد یہ دوسری بڑی کوشش تھی۔ جو ایک ملکی زبان کو مغربی علوم سے مالامال کرنے کی خاطر کی گئی تھی۔ سوسائٹی کا دفتر وہاں تھا جہاں برسوں مسلم یونی ورسٹی پریس رہا۔ ۱۸۶۶ء میں سرسید نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کیا۔ جو انگریزی اور اردو دونوں میں چھپتا تھا اور جس کا مقصد قوم اور حکومت کو ایک دوسرے سے قریب لانا اور ملک میں سنجیدہ اور تعمیری جذبے کی اشاعت کرنا تھی۔ یہ گزٹ سرسید کی وفات تک پابندی سے نکلتا رہا اس میں اس زمانے کے تمام اہم اخباروں کے اقتباسات برابر درج ہوتے تھے۔ اور آج بھی اس کے مطالعے سے ہم انیسویں صدی کے اضطراب و کشمکش اور جوش و جذبے کا اندازہ کر سکتے ہیں ۱۸۶۹ء میں سرسید نے ورناکیولر یونی ورسٹی کی ایک اسکیم پارلیمنٹ کو بھیجی اور اس پر زور دیا کہ علاوہ انگریزی میں تعلیم دینے کے حکومت ایک یونی ورسٹی مقامی زبانوں میں تمام علوم کی تعلیم دینے کے لئے قائم کرے۔ افسوس ہے کہ حکومت نے اس تجویز کو وہ اہمیت نہ دی جس کی وہ مستحق تھی۔

اب سرسید اس عقیدے پر مستحکم ہوتے جا رہے تھے کہ ہندستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً جلد سے جلد جدید تعلیم حاصل کر لینی چاہئے تاکہ نہ صرف انھیں روزگار ملے بلکہ وہ مغربی علوم سے آشنا ہوں۔ ان کی تہذیب

اور ادب کی روح کو سمجھیں، اور بحیثیت مجموعی زمانے کی رفتار اور وقت کے تقاضے سے ہم آہنگ ہو سکیں۔ ان کے لائق صاحبزادے سید محمود کو اعلیٰ تعلیم کے لیے وظیفہ ملا تھا اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے خود بھی انگلستان کا سفر کیا اور وہاں کے قیام کے زمانے میں وہاں کی ہر چیز کو غور سے دیکھا۔ کتب خانوں اور علمی اداروں سے فائدہ اٹھایا۔ مشاہیر سے ملے۔ ولیم میور کی لائف آف دی پرافٹ کے جواب کے لئے مواد تیار کیا اور چھپوایا اور تہذیب الاخلاق کا خاکہ بنایا۔ انھوں نے انگلستان سے اپنے دوستوں کو جو خط لکھے ان کے ایک ایک حرف سے ان کے قومی درد، علمی شغف اور گہری سوجھ بوجھ کا پتا چلتا ہے۔ ان کا زمانہ وہاں یا تو کتابوں کے مطالعہ میں یا تعلیمی اداروں کی سیر اور معلومات کی فراہمی میں گزرا۔ اس زمانے کا انگلستان فارغ البالی شان و شوکت اور صنعتی ترقی کے لحاظ سے اپنے شباب پر تھا۔ سرسید بھی اس روشنی سے کچھ خیرہ ہو گئے۔ مگر اس چکا چوند کے باوجود انھیں اپنے گھر میں اجالا کرنے کی فکر دامن گیر رہی چنانچہ جب انگلستان سے واپس آگئے دسمبر ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق نکالا تو اس کے پہلے مضمون کو اس طرح شروع کیا۔

"اس پرچے کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سویلزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے۔ تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں انھیں دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز اور مہذب قوم کہلائیں۔

سویلزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم نے ترجمہ کیا ہے مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں۔ اس سے مراد انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت تمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجے کی عمدگی پر پہنچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی خوشی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے، اور تمکین و وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے، اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔"

تہذیب الاخلاق سات برس کے قریب نکلا۔ پھر دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے بند ہو گیا۔ اس پرچے کی وجہ سے مسلمانوں کی مذہبی اور تہذیبی زندگی کی تجدید شروع ہو گئی۔ اصلاح و تجدید کا جو تصور سرسید کے ذہن میں تھا وہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کے کل شعبوں کو محیط تھا انھوں نے اگرچہ جزئیات پر توجہ نہیں کی مگر اس کی کسر ادب کی اصلاح پر زور دے کر پوری کر دی۔ سرسید کا مشن یہ تھا کہ اسلام کی ابدی حقیقت کی تفسیر عہد حاضر کی روشنی میں کریں، شبہ کی نظر سے نہیں بلکہ قدر کی نگاہ سے۔ تہذیب الاخلاق میں مذہب، تہذیب ادب، معاشرت قومی اخلاق پر برابر مضامین نکلتے رہے۔ اس پرچے سے جدید خیالات کی روشنی اور عقلیت کی کرن پھیلی حقیقت نگاری کا رواج ہوا، ادب کو بلند اور حیات بخش تصورات کی گرمی ملی مذہبی امور میں بھی فکر و نظر کی آزادی ملی بڑی سنجیدہ اور علمی نثر کا آغاز ہوا۔ جدید تعلیم کی اہمیت واضح ہوئی ایڈیسن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ادب کو درباروں اور محلوں سے نکال کر قہوہ خانوں اور بازاروں تک پہنچا دیا، سرسید نے ادب کو خانقاہ دربار اور کوچہ و بام سے نکال کر دفتروں، تعلیم گاہوں اور متوسط طبقے کے دل و دماغ تک پہنچایا۔

تہذیب الاخلاق میں سرسید اپنی فکر کی بلندی پر نظر آتے ہیں۔ اس نے قوم کی قیادت علماء اور رئیسوں کے بجائے متوسط طبقے کے ہاتھ میں دیدی۔ اس نے دین کی خاطر دنیا کو بھی سنوارنے پر زور دیا۔ باوجود شدید مخالفت کے اس کا اثر ہوا اور لوگ سرسید کے پیام کی طرف تیزی سے متوجہ ہونے لگے۔ سرسید مغرب کے اندھے مقلد نہیں تھے۔ وہ ملک و قوم کو اخلاقی اور علمی پستی سے نکالنا چاہتے تھے اور اسے جدید عالمی اخلاقی اقدار سے آشنا کرانا چاہتے تھے اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"دوسری قوم کی رسومات کا اختیار کرنا اگرچہ بے تعصبی اور دانائی کی دلیل ہے مگر جب وہ رسمیں اندھے پن سے صرف تقلیداً بغیر سمجھے بوجھے کی جاتی ہیں تو کافی ثبوت نادانی اور حماقت کا ہوتی ہیں"۔
ایک اور مضمون میں لکھتے ہیں۔

"اے صاحب یہ کون کہتا ہے کہ مہذب قوموں میں کوئی عیب نہیں ہوتا
مگر یہ تو دیکھو کہ ان میں عیبوں کے ساتھ بہت سی بھلائیاں اور خوبیاں بھی ہیں
ہم ان کے عیبوں کو کیا تکیں جب کہ ہمارے اندر عیب ہی عیب بھرے
ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ چھاج بولے تو بولے چھلنی کیا بولے جس میں تو سو سو چھید"
صرف تہذیب الاخلاق ہی سرسید کے انقلابی مشن کا بہت بڑا ثبوت ہے مگر
سرسید ذہنی انقلاب پر قانع نہ تھے وہ علمی دنیا میں اس کی مضبوط بنیاد بھی
رکھنا چاہتے تھے۔ مدرسۃ العلوم قائم کرنے کا خیال انھیں انگلستان کی مشہور
درس گاہ آکسفورڈ اور کیمبرج کو دیکھ کر ہوا۔ ان کا نصب العین تھا کہ یہ ادارہ
تین مدرسوں پر مشتمل ہو پہلے مدرسے میں تمام علوم و فنون کی تعلیم انگریزی میں
ہو جس سے سرکاری عہدے بھی ملیں اور ایک ایسی جماعت بھی پیدا ہو۔ جو
انگریزی میں کمال حاصل کرے اور اس کی بدولت تمام علوم انگریزی
سے اردو میں آجائیں۔ دوسرے مدرسے میں تمام علوم و فنون اردو میں
پڑھائے جائیں تاکہ وہ تمام لوگ جو غیر زبان پر قادر نہیں ہو سکتے اپنی مادری
زبان میں علوم و فنون کی تحصیل کریں۔ تیسرے مدرسے میں انگریزی اور اردو
مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبار کو عربی یا فارسی لٹریچر اور علوم میں کمال حاصل
کرنے کے مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ یہ طلبار مسلمانوں کے قدیم مذہبی
اور تہذیبی سرمایے کو موجودہ نسلوں تک پہنچا سکیں۔

افسوس ہے کہ ان لوگوں کو جو مغربی علوم حاصل کرنے کے سلسلے میں
سرسید کے ہم خیال تھے صرف پہلی قسم کے مدرسے سے زیادہ دل چسپی تھی اسلئے
اگرچہ مدرستہ العلوم قائم ہو گیا اور اس نے بڑی ترقی کی اور ملک و قوم کی
پوری زندگی پر اثر انداز ہوا مگر وہ سرسید کے عظیم خواب کی پوری تعبیر نہ بن سکا
حکومت کو صرف ایسی تعلیم سے ہمدردی تھی جو اس کی مشین کے لئے کل پرزے
مہیا کر سکے سرسید کے رفیق اور دوست زیادہ تر اس فکر میں تھے کہ ملازمتوں
کی دوڑ میں مسلمان پیچھے نہ رہ جائیں۔ سرسید کے مصلحانہ خیالات سے
ویسے ہی ایک بڑے طبقہ کو تعصب تھا۔ اس لئے سرسید مجبوراً اس
خیال سے کہ اس خواب کا جو بھی حصہ عملی شکل اختیار کر سکے کر لے، اہم اساد

کالج کے قیام کی جدوجہد میں لگ گئے اور اپنی زندگی ہی میں اسے پھلتا پھولتا اور قومی زندگی پر اثر انداز ہوتے دیکھ لیا۔

۱۸۷۵ء میں مولوی سمیع اللہ خاں کی مدد سے علی گڑھ میں ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم کیا گیا۔ سرسید سال بھر کے بعد بنارس سے پنشن لے کر آئے اور ہمہ تن کالج کے قیام اور اس کی ترقی کے منصوبوں میں منہمک ہو گئے ۱۸۷۷ء میں لارڈ لٹن نے مجوزہ کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ ۱۸۷۸ء سے کالج کے درجے شروع ہو گئے ۱۸۸۱ء میں ایم اے اور ۱۸۸۳ء میں قانون کے درجے کھلے انگلستان سے اچھے اچھے استاد خاص کوشش اور تلاش سے جمع کئے گئے۔ بیک، مارسین، آرنلڈ، والٹر ریلے کی مخلصانہ کوشش سے کالج نے بہت جلد ترقی کی۔ کالج کی اقامتی زندگی، تہذیب و شائستگی کھیل کود میں اعزاز نے اسے ملک کے ممتاز اداروں میں جگہ دلائی۔ سرسید نے اپنے مذہبی خیالات کو کالج میں جگہ دی، بلکہ دینیات کی تعلیم مروجہ دستور کے مطابق رکھی تاکہ ادارے کی مخالفت کم ہو۔ شروع سے اس میں ہندو طلباء کی تعداد خاصی رہی۔ اور ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۱ء تک ہندو اور مسلمان طلباء کی تعداد تقریباً برابر رہی۔ کالج کا پہلا گریجویٹ ایک ہندو تھا۔

سرسید کے اندر اعصابی قوت اتنی تھی کہ کالج کی بنیادوں کو مستحکم کرنے اور اس کو قبول عام عطا کرنے کے علاوہ اپنے علمی کام میں برابر مصروف رہے۔ تہذیب الاخلاق دوبارہ جاری کیا۔ گزٹ میں برابر لکھتے رہے اور ان کا آخری مضمون بھی گزٹ میں چھپا تھا۔ مگر سب سے زیادہ توجہ انہوں نے اپنی تفسیر قرآن پر صرف کی جس کی تیاری وہ عرصے سے کر رہے تھے۔ سرسید نے علمی کاموں کے لئے کبھی گوشہ نشینی اور تنہائی کی ضرورت محسوس نہ کی اور نہ عملی کاموں کی مصروفیات اور انہماک میں علمی کاموں کو پس پشت ڈالا۔ مسلمانوں کی تعلیم کے ہر پہلو پر وہ برابر توجہ کرتے رہے۔ اور اس غرض سے ۱۸۸۶ء میں انھوں نے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ اور اس کانفرنس کے ذریعہ سے پنجاب، بہار اور جنوبی ہند کے مسلمانوں میں نئے خیالات پھیلے، تعلیم کا چرچا ہوا، اور اصلاح معاشرت کی تحریکیں پروان چڑھیں اس زمانے میں انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس

سے علیحدہ رہیں۔ ان کے طرزِ عمل کے متعلق بعض حلقوں میں بڑی غلط فہمی ہے اور اس کی بنا پر کچھ لوگ سرسید کو فرقہ پرست اور ہندستانی قومیت کا مخالف کہتے ہیں۔ یہ رائے ناسمجھی پر مبنی ہے۔ کانگریس اس وقت اس ابھرتے ہوئے طبقے کی نمائندگی کر رہی تھی جو انگریزوں سے ملکی حکومت میں زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ حکومت خود اس کی حمایت کر رہی تھی تاکہ اس طرح انتہا پسندی کا توڑ ہو سکے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، آچاریہ نریندر دیو، سردار کے ایم پانیکر سب نے نہایت پرزور الفاظ میں لکھا ہے کہ سرسید بڑے محبِ وطن تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ ان کی تحریک میں ہندو دشمنی کو دخل نہ تھا۔ ہاں وہ اس وقت ایک ایسے طبقے کے لئے جو تعلیم اور سیاست میں دوسروں سے پیچھے رہ گیا تھا جدید تعلیم اور اصلاحِ معاشرت کی مہم سر کرنے کو زیادہ ضروری سمجھتے تھے دوسرے ان کا خیال تھا کہ حکومت جو پہلے ہی مسلمانوں سے بدگمان تھی ان سے اور بھی بدگمان ہو جائے گی۔ یہ رائے اس وقت کی مصلحت کے مطابق تھی۔ اور جیسا کہ مولانا محمد علی نے کوکناڈا کانگریس کے جلسے میں کہا تھا۔ اس وقت یہی پالیسی درست تھی۔ سرسید ہندستان کے مسلمانوں کو جدید دور کی پیچ در پیچ راہوں سے سلامتی سے گزارنے کے لئے کچھ وقت چاہتے تھے۔ انھیں فرقہ پرست یا قومی اتحاد کا دشمن سمجھنا بڑی بے انصافی ہوگی اگر انگریزوں نے ان سے فائدہ اٹھا کر پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کا طریقہ برتا یا فرقہ پرستوں نے اپنی کمزور بنیاد کو سہارا دینے کے لئے سرسید کے وقتی خیالات سے مدد لی تو اس سے سرسید کی عظمت پر کیا حرف آ سکتا ہے۔ باوجود کالج کے کاموں میں مصروفیت کے سرسید دوسرے پبلک کاموں میں بھی آخر تک شریک رہے امپیریل کونسل میں انھوں نے کئی مفید قانون پاس کرائے۔ البرٹ بل کی حمایت کی جس کی رو سے یورپین ملزموں کے مقدمے بھی ہندستانی حاکموں کی عدالت میں پیش ہو سکتے تھے۔ تعلیمی کمیشن میں حصہ لیا۔ اردو کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی۔ آخر میں سید محمود کی دماغی حالت نے انہیں بہت مضمحل کر دیا تھا آخر ۲۴ مارچ ۱۸۹۸ء کو اس مجدد و مصلح اور عظیم المرتبت انسان کا انتقال ہو گیا اور کالج کی مسجد میں اسے دفن کیا گیا۔

سرسید کا رنگ سرخ و سپید تھا چہرہ نہایت پر رعب پیشانی بلند

بھنویں جدا جدا آنکھیں متناسب اور روشن، گلے میں بڑی سی رسولی، جو داڑھی میں بالکل چھپی ہوئی تھی جسم فربہ ہاتھ پاؤں قوی اور زبردست لباس ترکی معاشرت انگریزی۔ آواز بلند تھی تقریر کرتے تو مجمع پر بے خودی سی چھا جاتی۔ ان میں بڑی ہمت و جرأت تھی آگرے کے دربار سے چلے آئے اور انگریز حاکم کی مخالفت کی ذرا پرواہ نہ کی کیونکہ ہندستانیوں کے ساتھ وہاں تعصب برتا گیا تھا۔ باوجود سینکڑوں خطروں کے "اسباب بغاوت ہند" چھپوائی جب کوئی تحریک شروع کی تو تن من دھن اس میں لگا دیا۔ انگلستان کا سفر کرنے اور سر ولیم میور کی "لائف آف دی پرافٹ" کا جواب لکھنے کے لئے انھوں نے اپنا قیمتی اثاثہ تک بیچ دیا۔ بجنور میں انکی خدمات کے صلے میں جاگیر عطا ہو رہی تھی۔ ان کی غیرت نے اسے گوارا نہ کیا۔ ان کی شخصیت میں بڑی مقناطیسیت تھی۔ دوست تو دوست دشمن بھی کھنچ آتے تھے۔ اکبر کو ان کے خیالات سے اتفاق نہ تھا اور اودھ پنچ میں ان کے خلاف کئی طنزیہ نظمیں لکھی تھیں جب وہ علی گڈھ آئے تو باوجود اصولی اختلافات کے ان کی نیک نیتی، خلوص، بیدار مغزی اور دل سوزی کے قائل ہو گئے۔ وہ بیک وقت بلند پایہ مصنف بھی تھے اور اعلیٰ درجہ کی انتظامی اور عملی صلاحیتوں کے مالک بھی جس پر انھوں نے نگاہ ڈالی وہ کندن ہو گیا۔ ان کے زمانے کے طالب علم بھی مختلف شعبوں میں، دھن کے پکے اور مخلص کارکن ثابت ہوئے۔ سر سید نے جو کام ہاتھ میں لیا اسے نہایت خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ وہ دوستوں کے عاشق تھے اور دوست بھی ان پر جان چھڑکتے تھے۔ مگر اپنے اصولوں اور خیالات میں کسی رشتے کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ وہ بڑے بے تعصب آدمی تھے۔ اور اپنے وطن سے بڑی محبت کرتے تھے اور اس کی پستی اور زبوں حالی پر انگلستان میں بیٹھے کڑھا کرتے تھے۔ پٹنہ کی ایک تقریر میں انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے متعلق کہا تھا۔

"ہندستان ہی ہم دونوں کا وطن ہے۔ ہندوستان ہی کی ہوا سے ہم دونوں جیتے ہیں۔ مقدس گنگا اور جمنا کا پانی ہم دونوں

پیتے ہیں ہندستان ہی کی زمین کی پیداوار ہم دونوں کھاتے ہیں۔ مرنے
میں جینے میں ہم دونوں کا ساتھ ہے۔ ہندستان میں رہتے رہتے دونوں
کا خون بدل گیا۔ دونوں کی رنگتیں یکساں ہوگئیں۔ دونوں کی صورتیں
بدل کر ایک دوسرے کے مشابہ ہوگئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی
سینکڑوں رسمیں اختیار کرلیں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کی سیکڑوں عادتیں
لے لیں یہاں تک ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر ایک
نئی زبان اردو پیدا کرلی جو نہ ہماری زبان تھی نہ ان کی۔ پس اگر ہم اس
حصہ سے جو خدا کا حصہ ہے قطع نظر کرلیں تو درحقیقت ہم ہندستان میں
باعتبار اہلِ وطن ہونے کے ایک قوم ہیں۔ اور ہم دونوں کے اتفاق اور
باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی
وبہبودی ممکن ہے اور آپس کے نفاق اور ضد و عداوت ایک دوسرے
کی بدخواہی سے ہم دونوں برباد ہونے والے ہیں میں نے بار ہا کہا ہے اور
پھر کہتا ہوں کہ ہندستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت
اور رسیلی دو آنکھیں ہندو و مسلمان ہیں اگر وہ دونوں آپس میں نفاق
رکھیں گے تو وہ ہماری دلہن بھینگی ہو جائے گی۔ اور اگر ایک دوسرے
کو برباد کردیں گے وہ کانی بن جائے گی۔

انیسویں صدی کے آخر نصف کا سارا سوز و ساز سرسید ان کی
شخصیت اور کارنامے میں سمٹ آتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ان کی
رہنمائی سے حرکت اور روانی پیدا ہوئی۔ اردو زبان کو انھوں نے
سنجیدہ علمی مسائل کے اظہار کے قابل بنایا اور خود ایسی نثر لکھی جس میں
نازک سے نازک مسائل باتوں میں بیان ہو جائیں۔ انھوں نے سب سے
پہلے قدیم طرزِ شاعری کی خامیاں واضح کیں۔ اور سادگی اصلیت اور فطرت
نگاری کی تلقین کی۔ انھیں کی پرسوز شخصیت سے متاثر ہوکر حالی نے
مسدس لکھی جسے خود سرسید نے خدا کے دربار میں اپنا سب سے بڑا کارنامہ
سمجھا۔ محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، نذیر احمد، شبلی، حالی، ذکاء اللہ
وحید الدین سلیم انھیں کے فیضِ صحبت سے علم و ادب کے آفتاب و ماہتاب
بنے۔ اور علی گڑھ تحریک ایک زندہ اور توانا ذہنی رو بن گئی۔ اور اس نے

ملک کی تہذیبی اور ادبی زندگی پر بڑے دور رس اثرات ڈالے۔

آج علی گڈھ کے اساتذہ اور طلبار کے سامنے جو مقدس کام ہے اس کے پورا کرنے کے لئے سرسید کے پیام کی روح اور ان کے بنیادی افکار کی نوعیت کو برتنا اور سمجھنا اور بھی ضروری ہے۔ ماضی کا عرفان ہمیشہ مستقبل کی تعمیر کا اشاریہ ہوتا ہے۔

فراق گورکھپوری

میر کی عالمگیر مقبولیت

میں نے یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہوئے میر کی عالمگیر مقبولیت کا فقرہ استعمال کیا ہے کہ میر کا کلام ان معنوں میں عالمگیر نہیں ہو سکا ہے جن معنوں میں ہومر کی نظمیں، ورجل کا رزمیہ، مہابھارت، رامائن، شاہنامہ اور شیکسپیئر کے ڈرامے عالمگیر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ میر کی شاعری ہندستان کے انھیں علاقوں میں سمجھی جا سکی ہے جہاں کی زبان کو ہم کبھی ہندی کہتے ہیں اور کبھی اردو کہتے ہیں۔ اور اس علاقے میں بھی ان لوگوں کی تعداد ان علاقوں کی پوری آبادی میں پچاسی فی صدی ہے۔ پھر میں نے عالمگیر مقبولیت کا فقرہ کیوں استعمال کیا۔ اس فقرہ میں عالمگیر کا لفظ ایک اضافی حیثیت رکھتا ہے یعنی میر کی شاعری نے اب سے دو سو برس پہلے جنم لیا۔ اور اس دو سو برس کے عرصہ میں اردو میں کئی دیو قامت ہستیاں پیدا ہوئیں ان تمام شاہیر اردو کا آپس میں اختلافِ مذاق و مزاج رہا ہے اور اس کے باوجود میر کی عظمت کے سامنے سب کے سب نے سرِ تسلیم خم کیا ہے۔ یعنی اردو کی تمام دنیا میں گذشتہ ۲۰۰ برس سے میر کو عالمگیر مقبولیت حاصل رہی ہے۔ ایک آدمی بھی اردو دنیا میں میر سے منکر نہیں ہوا۔

اب مقبولیت کے لفظ کو لیجئے۔ مقبولیت کی سطحیں ہوتی ہیں شدتیں ہوتی ہیں ہمارے دل و دماغ کی خارجی رگوں کو چھونے والی شاعری کو سطحی مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے دل و دماغ کی حساس ترین رگوں کو چھونے والی شاعری اور ہماری انسانیت کے حریم راز کی آوازیں جاننے والی شاعری حقیقی اور مستقل مقبولیت حاصل کرتی ہے، میرؔ نے خود کہا ہے۔

کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کچھ بات ایسی کچھ نہیں ایہام بھی نہیں

پھر کہتے ہیں ؎

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
درد دل لاکھوں کئے جمع تو دیوان کیا

اور پھر کہتے ہیں ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیئے گا
پڑھتے کسو کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا

میرؔ نے جو باتیں مندرجہ بالا تین اشعار میں اپنی شاعری کے متعلق کہی ہیں اتنی صداقت کے ساتھ غالبؔ، آتشؔ، انیسؔ اور اردو کے دوسرے بڑے سے بڑے شعراء اپنے متعلق یہ باتیں نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ دوسرے شاعروں کے کارنامے دوسرے محاسن کے حامل ہیں ان مخصوص محاسن کے حامل نہیں ہیں جنہیں مدنظر رکھ کر میرؔ نے یہ دعویٰ کیا۔

ہماری شخصیتوں یا زندگیوں کے ٹھیٹھ سے ٹھیٹھ حصے پر میرؔ کی شاعری کا ردِّ عمل ہوتا ہے۔ اس حصے کے لئے علم و فلسفہ، نازک خیالی، مضمون آفرینی، دقت نظر، صنائع بدائع، علم البیان، فصاحت و بلاغت وہ مرکزی اہمیت نہیں رکھتے اور وہ انسانی اپیل نہیں رکھتے جنہوں نے کلام میرؔ کو مانوس ترین معنوں میں عالمگیر مقبولیت بخشی ہے۔

تاویل، تفسیر و تشریح کی تمام دوررس، وجز رس کوششوں کے باوجود حقیقی شاعری کے راز بتائے یا گنوائے نہیں جا سکتے کیوں کر کیسے اور کہاں کوئی شاعر حقیقی شاعری کر جاتا ہے، اس کو بتانا ناممکن ہے حقیقی یا فطری شاعری کو ہم ایک معجزہ ہی کہہ سکتے ہیں یوں تو علت و معلول کے اصول کی

ہمہ گیری عام طور سے مان لی گئی ہے۔ پھر بھی فطرت اور زندگی کی خلاقی کا
بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔ فنکارانہ یا شاعرانہ تخلیقات کے وجود میں آنے
کے بعد یہ بتایا جا سکتا ہے کہ وہ کیونکر وجود میں آئیں۔ فنون لطیفہ کی سحرکاری
اسی کا نام ہے لیکن یہ باتیں تو ہمارے شاعروں کی ہر تخلیق کے متعلق کہی
جا سکتی ہیں اس لیے ہمیں کچھ اور گہرائی میں جانا پڑے گا۔ میر کی جادو نگاری
اور کلام میر کی سحرکاری میں جو بات سب سے زیادہ اہم معلوم ہوتی ہے، جو
حقیقت سب سے زیادہ نظر آتی ہے، اور جس میں اس کی عالمگیر مقبولیت
کا راز پنہاں ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے داخل ترین محسوسات کی اتنی فطری
مصوری اور وہ بھی کم سے کم الفاظ میں سادہ سے سادہ الفاظ میں معمولی سے
معمولی الفاظ میں اردو کا کوئی دوسرا شاعر نہیں کر سکا ہے۔ ان کے ایسے اشعار
ہمارے دلوں کی آخری تہوں سے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں معلوم ہوتا
ہے کہ میر نہیں بول رہے ہیں ہماری انسانیت اور ہماری فطرت بول رہی
ہے۔ فروعات ضمنیات اور تمام مصنوعات سے معرا اور آزاد ہو کر یہی بات
میر کی آواز کو زندگی بنا دیتی ہے ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ فن شاعری
حقیقی شاعری کی راہ میں حائل تھا الفاظ و بیانات زندگی کی آواز چھپا اور
دبا دیتے تھے یا بدل دیتے تھے یا انھیں ناقص و ناکمل اور خارجی طور پر پیش کرتے ہیں
میر کی شاعری فن کو صلیب پر چڑھا کر اسے پھر سے زندہ کر دیتی ہے الفاظ کو
گھٹا کر ان کے اثرات کو لامتناہی بنا دیتی ہے۔ اور شاعری کو شاعر کی آواز نہیں
بلکہ زندگی کی آواز بنا دیتی ہے۔ کلام میر میں ہم اپنے کو چھوتے ہوئے ہم اپنے آپ
سے قریب ترین ہوتے ہوئے، ہم اپنے آپ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں چونکہ
شاعری میں ہم اپنے آپ کو قبول کرتے ہیں، چونکہ اس کلام میں زندگی کو اپنی
مقبولیت کا احساس ہو جاتا ہے، اسی سے کلام میر کو عالمگیر مقبولیت حاصل
ہے۔ الفاظ ہمارے شعور سے ڈھیلے پڑ کر گر جاتے ہیں۔ اور احساسات محض رہ جاتے
ہیں۔ اور معنی دنیا کا عالم پیدا ہو جاتا ہے۔ رسوم کی تہیں اترنے لگتی ہیں تکلفات اور
بناوٹ کے گرد و غبار صاف ہونے لگتے ہیں۔ نیچے ہم میر کے کچھ اشعار دیتے ہیں۔
ان میں ہر شعر دعوت تامل دیتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ ان اشعار کو جلدی جلدی
پڑھتے نہ چلے جائیے۔ میر کی شاعری ہمیں کئی پیام دیتی ہے۔ لیکن میر کے نزدیک

اس شاعری کا اہم ترین پیام ٹھہرا ؤ ہے۔ ہر شعر پڑھ کر رک کر سوچنے لگیے اور اس حقیقت پہ غور کیجیے کہ کیا اردو کے بڑے سے بڑے شاعر اس خلوص اس صداقت اس معصومی اس انسانی لہجہ اور اس تہہ رسی کے ساتھ کوئی شعر کہہ سکے ہیں۔

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

نامردانہ زیست کرتا تھا
میر کا طور یاد ہے ہم کو

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحا سا ہو گیا ہے

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو ٹپکا ہے
ہم نے جانا تھا کہ اے میر یہ آزار گیا

دلِ پرخوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ہم سے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
میر کو تم عبث اداس کیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

کوئی ناامید نہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے

ہو گئی شہر شہر رسوائی
اے مری موت تو بھلی آئی

وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں

رات بھر شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

کہا میں نے کتنا ہے گل کو ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

نہ بھائی ہماری یہ ہمت نہیں
تجھی سے اٹھیں میر یہ خواریاں

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر
ہے پیارے ہنوز دلی دور

میر صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار

مرگِ مجنوں سے عقل گم ہے میر
کیا دوانے نے موت پائی ہے

سہل ہے میر کا سمجھنا کیا
اس کی ہر بات اک مقام سے ہے

جاتا ہے آسماں لیے کوچہ سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

آئینہ خانہ ہے یہ سارا جہاں منہ نظر آتا ہے دیواروں کے بیچ
یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے سو بھی ایک عمر میں ہوا معلوم
یہ جو مہلت جسے کہیں ہیں عمر دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ

رنگِ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے

مرتے جو ہم اس گل بن سارا یہ خلل جاتا
نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا

خاک حسرت زدگاں سے تو گزر بے وسواس
ان ستم کشتوں سے اظہارِ تمنا کیا ہو

دور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے عشق بن یہ ادب نہیں آتا
یہ توہم کا کارخانہ ہے یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ مذہبِ عشق اختیار کیا
سنتے ہیں پہلے تھا بتوں میں رحم ہے خدا جانیے یہ کب کی بات

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
یہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

تری چال ٹیڑھی تری بات الٹی
تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے

ہو گا کسی دیوار کے سایہ میں پڑا میرؔ کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن
سینے میں جیسے دل کو کوئی ملا کرے ہے

پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے

جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

عالم عالم عشق و محبت دنیا دنیا شہرت ہے

دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

نہیں ہے چاہ بھی اتنی بھی دعا کر میر

کہ جواب دیکھوں لے میں نہ بہت پیار کروں

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے

اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے ہو

ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز اسی خانہ خراب کی سی ہے

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں حالت اب اضطراب کی سی ہے

لگا نہ جی کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے

جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

وہ کھلے بال سوئے ہے شاید رات کو میرا جی بکھر جا ہے

باد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ

نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی

شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

وصل و ہجراں منزلیں دو ہیں جو راہ عشق کی

دل غریب ان میں خدا جانے کہاں مارا گیا

دنیا کی سیر میر کی صحبت میں ہو گئی

قسمت سے آج ہم کو یہ بے دست و پا ملا

تم جو چاہو سو کہو میر کو چاہیں ہیں تمہیں

اور ہم لوگ تو سب ان کا ادب کرتے ہیں

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش

ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

نکلیں اگر وہاں سے تو ہم تلک بھی پہونچیں
پھرتی ہیں وہ نگاہیں پلکوں کے سائے سائے

دل سے اٹھتا ہے جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

غزل کی شاعری ان اشعار سے یہی نہیں کہ اونچی ہوگئی بلکہ ان سے اونچی جا نہیں جاسکتی۔ یاد اور تلاش کرنے سے میرؔ کے یہاں ان بلند ترین اشعار سے لگا کھانے والے زیادہ سے زیادہ شاید ڈیڑھ سو اشعار اور مل سکیں گے لیکن فارسی یا اردو کے کسی شاعر کے یہاں سچی شاعری کے اتنے نمونے نہیں ملیں گے ان اشعار سے ہمارے دلوں پر ہمارے وجدان پر اور ہماری قوت غور و فکر پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں آیئے ان کا تجزیہ کریں۔

(۱) ان اشعار میں فن شاعری کے خارجی، دل فریب و نظر فریب لوازم کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے۔ "شاعری" یا فن کاری کو کم سے کم کرکے اور زیادہ سے زیادہ گھٹا کے وہ تاثیر پیدا کی گئی ہے جو میرؔ کی عالمگیر مقبولیت کا راز ہے۔

(۲) ان اشعار میں خیال آرائی یا مضمون آفرینی نہیں کی گئی ہے بلکہ حالات کی تصویر کھینچی گئی اور وہ کم سے کم اور سادہ سے سادہ خطوط میں عشقیہ شاعری میں ان اشعار کا وہی مرتبہ ہے جو مذہب و فلسفہ میں ہم سوتروں منتروں یا آئیتوں کو دیتے ہیں حالات کا لفظ یہاں بہت اہم ہے اس لئے کہ داخلی حالات یا واردات پر خیالات کے جو متعدد دبیز پردے پڑے ہوتے ہیں ان پردوں کو دکھا دینا ہی اکثر حالات کی مصوری سمجھا جاتا ہے۔ حالات کی مصوری کرنے میں میرؔ اپنی اور ہماری انسانیت کو بے نقاب کرکے اس کی معرّا اور حقیقی صورت کو پیش کر دیتا ہے۔

(۳) عشق سے متاثر ہونا بڑی عظیم اور بڑی خطرناک معذوری ہے عشق کے سامنے دولت، قوت، ثروت اور انسان کی تمام صلاحیتیں اور عظمتیں بے بس ہو جاتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس بے بسی پر ہم امداد غیبی سے کسی قدر قابو حاصل کرتے ہیں۔ ایک طریقہ اس بے بسی پر قابو پانے کا یہ ہے کہ عشق کی بے بسی کا ہمیں وجدانی شعور حاصل ہو جائے۔ یہ وجدانی شعور

ایک قوت شفا کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے عشق کے دکھ درد کی تحلیل نفسی ہو جاتی ہے۔ ہم اس دکھ درد کو دیکھ لیتے ہیں۔ اور اسے ایک اضطراری کیفیت سے بدل کر شعور محض میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ارسطو اسے اسہال کہتا ہے۔ یہی اسہال المیہ ادب کا مقصد ہے۔ رو لینے کے بعد زندگی جو سنبھالا لیتی ہے اور جو نئی توانائیاں حاصل کر لیتی ہے وہی اثر میر کے پر درد اشعار سے پیدا ہوتا ہے

(۴) میر کے اشعار کی تعداد تیس ہزار سے بھی زیادہ ہے ان کی تمام شاعری میں اس زمانے کے سماج کی تنقید بہت کم ملتی ہے۔ کیا یہ بات میر کے خلاف جاتی ہے۔ میرا جواب ہے کہ ہرگز نہیں۔ میر کا زمانہ وہ زمانہ نہیں تھا جو فردوسی کالیداس تلسی داس شیکسپیر سعدی اور دوسرے نقادانِ حیات مشاہیر ادب کو ہاتھ آیا۔ افراتفری اور انتشار سے مجبور ہو کر میر کے زمانے میں کوئی بھی دوسرا بڑا حقیقی شاعر ہوتا تو اسے میر ہی کی طرح اپنی شخصیت کے اندر جا کر پناہ لینی پڑتی اور میر نے بھی یہی کیا میر نے سماجی زندگی کو ہاتھ نہیں لگایا اور نہ لگا سکتے تھے لیکن اس شخصیت کے اندر کی دنیا کتنی بڑی ہے کتنی عظیم ہے اور کتنی دائمی قدروں کی حامل ہے کتنی عالمگیر انفرادیت رکھتی ہے اس کا اندازہ ہمیں میر کی شاعری کے لب و لہجہ سے ہوتا ہے اور ان تہوں اور پرچھائیوں سے ہوتا ہے جن کی نشاندہی میر کی شخصیت کرتی ہے۔ میر کے اشعار پکار پکار کر کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ ہمیں ایک بڑی شخصیت نے جنم دیا ہے۔

(۵) میر کی عظمت اور بڑے پن کے عناصر ترکیبی کیا ہیں؟ پہلا عنصر جس کا پتہ چلتا ہے کہ میر معمولی یا جگ بیتی کہتے ہوئے بھی ہمیں اس بات کا احساس کراتے ہیں کہ یہ معمولی باتیں جس انداز میں کہی گئی ہیں وہ ایک آفاقی شعور کی پیداوار ہیں۔ میر کے بکھرے ہوئے آنسوؤں میں ہمیں بحر حیات کی گہرائیوں اور وسعتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ میر کی آہ و فغاں میں فقش جہت کی ہواؤں کی سنسناہٹ ہے۔ میر جب اپنے دل پر ہاتھ رکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس نے انسانیت کے دل پر ہاتھ رکھا ہے۔ دیگر میر عالمگیر بن جاتا ہے دوسرا عنصر وہ انسانی لہجہ ہے اور اس لہجے کا ٹھہراؤ اور اس کی تھرتھراہٹیں ہیں جو میر کی آواز کو زندگی کی آواز بنا دیتی ہیں میر اپنے بہترین اشعار

میں جو الفاظ لاتے ہیں وہ الفاظ آفاق کے حامل ہوتے ہیں اور بیک وقت اپنے اختصار کے باوجود زمین اور ستاروں کو چھوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں میر کے یہاں ہر معمولی بات جتنی ہی معمولی ہوتی ہے اتنی ہی غیر معمولی بن جاتی ہے۔ اس طرح لفظوں کا رس کوئی شاعر نچوڑ نہیں سکا ہے۔ ہندوستانیوں میں اور غالباً اسلامی تصوف میں بھی شبد کے لفظ سے جس آفاقیت کی طرف اشارہ ہے اس کا اندازہ میر کے انتخاب و استعمال الفاظ سے ہمیں ہوتا ہے غلو کی یہ کیفیت اپنے الفاظ سے یا میر ہی کے الفاظ کو استعمال کر کے دوسرے شعرا نہیں پیدا کر سکے۔ یوں تو فرد یا شخص کا لفظ عالمگیر کے منافی ہے لیکن میر کے یہاں فردیت و شخصیت عالمگیر بن جاتی ہے ہر سچائی پورے آفاق پر محیط ہوا کرتی ہے۔ مخصوص و محدود ہوتے ہوئے بھی چھوٹی سے چھوٹی سچائی بڑی سے بڑی سچائی بن جاتی ہے۔ معمولی سے معمولی حالت آفاق کی کہانی بن جاتی ہے اس کی ہر بات ایک مقام سے ہے۔

۶۔ بہت سے چھوٹے بڑے لوگ اس دھوکے میں پڑ جاتے ہیں کہ عظیم شخصیت بہت سے مختلف علوم بہت سی مختلف صلاحیتوں بہت سی عملی قوتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہے تعداد اور میزان، لمبائی چوڑائی اور خارجی حساب کتاب سے عظمت کی پیمائش نہیں کی جا سکتی۔ میر نے اپنے اکثر اشعار میں کچھ لوگوں کو بے حقیقت اور بے تہہ کہا ہے۔ سطحیت کی لعنت سے بڑے بڑے عالم و فاضل اور تاریخ کے سورما بچ نہیں سکے ہیں شخصیت کی سطحیت کیا ہے؟ اور گہرائی کیا ہے؟ وہ گہرائی جو شخصیت کو عظمت دیتی ہے اس پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ میر کی عظمت اسی تہہ در تہہ شخصیت میں یا شخصیت کی اسی خاصیت میں ہے، اسی داخلیت میں ہے جس کا اندازہ میر کے بہترین اشعار نے قرار دیا ہے بڑے آدمی میں معمولی آدمیوں یا عوام الناس کی ہی صفتیں ہوتی ہیں لیکن یہ صفتیں اتنی گہری ہوتی ہیں کہ صفات میں ذات بن جاتی ہیں ہر بڑے فن کار میں امیت اور جبلیت ہوتی ہے۔ اسی امیت اور جبلیت کی روحانی شدت میں اس عظمت کے راز مضمر ہوتے ہیں

جس عظمت کو ہم میر سے منسوب کرتے ہیں میں نے پچھلے کئی برس میں یہ محسوس کیا ہے کہ زندگی کی عظمت کے حقیقی رموز کچھ اس قسم کے

ہوتے ہیں جو عنصری کائنات کی عظمت میں پنہاں ہیں۔ عظیم شخصیت ڈگری یافتہ شخصیت کا نام نہیں ہے۔ عظیم شخصیت کی مشابہت دریا اور سمندر سے ہوتی ہے زمین اور آسمان سے ہوتی ہے، نباتات اور وحشی طیور سے ہوتی ہے، اور جو عظمت بچوں میں یا معمولی سے معمولی اور ہیچ سے ہیچ آدمیوں کے اندر پنہاں ہے اس سے ہوتی ہے اور یہی عظمت ہم میر کی شخصیت میں پاتے ہیں لیکن ان عظمتوں کو مہمیز کرنے والی چیزیں بھی ہوتی ہیں جن کا تعلق مطالعہ مشاہدہ اور اکتسابِ علوم سے ہے، میر اپنے زمانے کے علوم متداول اور غیر متداولہ سے بخوبی واقف تھے لیکن ان کی حقیقی عظمت کو ہم ایک ایسا "عظمت جہل" کہہ سکتے ہیں جسے میں نے امیت اور جبلیت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اور جس کے بارے میں اصغر گونڈوی نے کہا ہے۔ ؎

مقام جہل کو پایا نہ علم عرفاں نے

یہی امیت اور جبلت ہمیں میر کی بہترین شاعری میں ملتی ہے۔ میر کی شاعری عنصری یا Element تاعری ہے۔

۷۔ اردو کے کسی اور شاعر کے کلام میں اس کی ذاتی شخصیت اور کردار کا اتنا شدید اندازہ نہیں ہوتا جتنا ناقابلِ انکار اندازہ شخصیت میر کے کلام سے ہوتا ہے۔ میر کا ہر شعر خواہ اس کا موضوع کچھ بھی ہو میر کی تصویر پیش کر دیتا ہے اور یہ تصویر انتہائی حد تک جانی پہچانی تصویر اس لئے ہو جاتی ہے کہ خارجی طور پر یہ تصویر ایک ان دیکھی تصویر ہے یہ تصویر سراپا چمکا ہے میر نے کہیں کہیں "تم" کا ضمیر استعمال کیا ہے۔ تم کے لفظ میں جو چمکار اور تھرتھراہٹ یا جو اپنائیت میر نے کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے اس کی مثال اردو شاعری میں نہیں ملتی بلکہ شاید دنیا کی شاعری میں بھی بہت کم ملے گی۔ مانوسیت اور یگانگی کا یہ لہجہ جادو کا اثر رکھتا ہے۔ روایتی طور پر میر ایک بگڑے دل، بد دماغ اور چڑچڑے آدمی مشہور ہیں۔ لیکن میر کو برافروختہ کر دیتے تھے ایسے لوگ جن میں یگانگی، مردم شناسی، تہذیب، خلوص اور حقیقی انسانیت کی کمی ہوتی تھی۔ میر کی غزلیں اور مثنویاں ہمیں یہ یقین دلا دیتی ہیں کہ میر مجسم پیار تھے، صرف محبوب کے لئے نہیں بلکہ کائنات کے ذرہ ذرہ کے لئے!

بیگانہ (علیگ)

ٹھیکیدار کی موٹر

انسان نے موٹر کی ضرورت کب محسوس کی یہ کب ایجاد ہوئی اور اس کا سہرا کس کے سر رہا یہ داستان طویل خشک اور غیر دلچسپ ہے۔ جس کا بیان نہ میرے لئے کسی نشاط کا باعث ہوگا۔ اور نہ آپ کو دلچسپی ہوگی بہرحال اس کا تذکرہ اس طرح ضروری ہے جس طرح غزلوں کے وہ اشعار جنہیں شاعر بڑی دانائی اور ہنیترے سے ہر اچھے شعر کے بعد سناتا ہے تاکہ مشاعرے کا توازن بھی قائم رہے اور وہ اپنے چیدہ چیدہ اشعار جن میں بزعم خود اس نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے حاضرین کو خاص طور پر متوجہ کر کے سنا بھی سکے۔ مشاعروں میں توازن رکھنے کے لئے بھرتی کے شاعر بڑا کام دیتے ہیں اول تو یہ خود داد بیداد کی حد تک پہنچا کر دم لیتے ہیں دوسرے اگر ان کو کوئی داد دے تو یہ تہمت تخلص اٹھانے والے نہ صرف اس وقت اظہار خاکساری فرمائیں گے بلکہ اس کے بعد بھی سر راہ ہر قسم کی ملاقاتوں میں تجدید ممنونیت کرتے رہیں گے۔ ان کے غزل سنانے کے دوران مگر حاضرین میں طلباء زیادہ ہیں تو خدا حافظ، اگر سنجیدہ صحبت ہے تو حضرات و خواتین کو سگریٹ پان اور دیگر حوائج ضروریہ سے

متمتع ہونے یا فراغت پانے کے مواقع فراہم ہو جاتے ہیں۔ اکثر منتظمین مشاعرہ اپنے اخلاص اور انہماک میں بھول جاتے ہیں کہ نو بجے شب سے لے کر طلوع سحر تک انسان تو خیر انسان ہے غریب شعراء کو بھی بعض ناگفتنی ضروریات پیش آسکتی ہیں۔

ہاں تو ذکر موٹر کا تھا بات دور جا پڑی یقین فرمایئے کہ آپ خواہ ڈرائیور ہوں صاحب کار ہوں، یا بیکار ہوں، موٹر کے بارے میں آپ کی فنی یا غیر فنی واقفیت اچھی خاصی ہوگی۔ اور آپ نے مختلف حالتوں، نمونوں اور مزاجی کیفیات کی موٹریں دیکھی ہوں گی وہ بھی جن کے متعلق کہا ہے کہ "اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے" اور وہ بھی جن پر "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" صادق آتا ہے — خدا ترس ڈھکیل رہے ہیں، بچے تالی دے رہے ہیں نوجوان تمسخر کر رہے ہیں، بوڑھے لاحول بھیج رہے ہیں۔ مگر موٹر ہے کہ آگے بڑھنے کا نام نہیں لیتی۔ ہاں کبھی کبھی ایک جھٹکا سا لے کر چھینک ضرور دیتی ہے تاکہ آپ کو نفس کی آمد و شد کا احساس رہے اور آپ یہ مزاحیہ شو دانت پیس پیس کر دیر تک دکھاتے رہیں۔ وہ حسین و بیش قیمت موٹریں بھی جن کا ہارن فردوس گوش ہوتا ہے اور جن میں کوئی جنت نگاہ کسی سائنس نما مرد کے پہلو کی زینت ہوتی ہے، اور وہ پر ہول فوجی گاڑیاں بھی جنہیں دیکھ کر محسوس ہوتا ہے گویا کسی طویل و عریض بم میں پہیے لگے ہوئے ہیں اور اب یہ کچھ دیر میں بھک سے اڑ کر گرد و پیش کی ہر چیز کو فنا کر دے گا۔ اس کے علاوہ اور موٹریں بھی جن میں گرلز کالج کی لاری سے لے کر جیل اور ریڈ کراس کی گاڑیاں تک اس طرح شامل ہیں گویا بقیہ دو کی ضرورت بھی محض اس پہلی کی وجہ سے ہوئی۔ نہ وہ ہوتیں نہ یہ ہوتی لیکن جس موٹر کیلئے میں آپ کو زحمت دے رہا ہوں اس کو ممکن ہے آپ نے دیکھا ہو مگر خصوصیات کا اندازہ آپ ہرگز نہیں لگا سکتے۔ خصوصیات پر ریسرچ کوئی مبارک فعل نہیں اور چیزوں کو جانے دیجئے اگر آپ انسانوں ہی کے بارے میں ریسرچ فرمائیں تو دنیا آپ کے لئے رہنے کے قابل نہ رہے گی۔

میرے ایک عزیز دوست ہیں جن کی عرفیت ٹھیکیدار سمجھ لیجئے، — اسم گرامی اس خوف سے نہیں کہتا کہ ممکن ہے آپ پہچان جائیں اور وہ برا مان

جائیں گو ان کی خفگی اختیاری ہوتی ہے اور بقیہ حرکات اضطراری۔ آپ اپنے اخلاص و مروت کی وجہ سے احباب میں بہت عزیز ہیں ہو سکتا ہے کہ سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو، مگر کسی مسلمہ امر کی تکذیب بھی کچھ نامناسب سی بات ہے ایک مرتبہ آپ کے مکان پر بچوں کا ہجوم دیکھا قریب جا کر دیکھا کہ ایک موٹر ہے جس سے بچے اس چرخی والے جھولے کا کام لے رہے ہیں جس کی زیارت میلوں میں نصیب ہوتی ہے۔ موٹر کا یہ عالم کہ "یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا" غازیوں کے وہ رہوار جن کی وجہ سے گھوڑوں کے لئے غازی مرد کا خطاب ایجاد ہوا معرکہ جہاد سے اس قدر زخم خوردہ اور چور چور نہ پلٹے ہوں گے جس قدر کہ وہ موٹر نظر آتی تھی اور اس کے قریب ہی ٹھیکیدار آنکھیں نیم وا کئے ہوئے کسی ایسے عزیز سے تعارف کرانے والے تھے جو گیبرڈین کے سوٹ میں ملبوس ہے اور تبرک اسلامی کے طور پر گوگلس، سگار لائٹر سگریٹ کیس اور پارکر فونٹین پن سے بھی مسلح ہے۔ اس موٹر کے متعلق میرا ابتدائی خیال کہ کسی کباڑیے نے پوسٹ مارٹم کرنے کے لئے ٹھیکیدار سے جگہ کی اجازت حاصل کر لی ہوگی، غلط نکلا اور پتہ چلا کہ ٹھیکیدار کی خرید کردہ ہے جسے موصوف نے ٹیوب ٹائر کی بوسیدگی، پوشش کی ردی حالت، رنگ کی خرابی، بیٹری اور لیمپس کی عدم موجودگی کو نظر انداز کر کے انجن کے محاسن اور مستریوں کی یقین دہانی کو ملحوظ رکھ کر بخیال تجارت مناسب داموں میں خرید فرما لیا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ اس کی خریداری میں کامیابی محض رحمتِ خداوندی کی بنا پر ہوئی ہے ورنہ بہت سے خریدار جمع ہو گئے تھے آخر میں یہ مژدہ بھی ملا کہ صرف تین چار سو روپے خرچ کرنے سے اس کی قیمت اتنے ہی ہزار ہو جائے گی اور مرمت ہو جانے اور فروختگی کے درمیان کے وقفہ میں پکنک اور شکار کے بھی کام آئے گی اس دوران میں میرے چہرے سے اس قسم کا اظہار نہ ہوا جو ٹھیکیدار کے لئے دل خوش کن ہوتا اور نہ میں نے کچھ کہا میرے کہنے کی ضرورت اس لئے بھی نہ پڑی کہ اول تو میں طبعاً کم گو آدمی ہوں دوسرے ٹھیکیدار کی تمام تر گفتگو محض اطلاع تھی کوئی استفسار نہ تھا جو اظہار رائے کی گنجائش ہوتی۔ ٹھیکیدار کی گفتگو کا پورا زور انجن کی اچھائیاں بیان کرنے

میں صرف ہو رہا تھا۔ مستریوں کے فیضِ صحبت سے انھیں موٹر کے بعض پرزوں کے نام اس زبان میں یاد ہو گئے تھے جو خود موٹر کے موجد کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔

موٹر درست ہو گئی بیٹری نے اس کی آنکھوں کو بینائی بھی عطا کی اور بیداری بھی، روغن اور رنگ بھی نکھر گیا۔ پوشش بھی دیدہ زیب اور آرام دہ ہو گئی ہارن کو گویائی ملی اور بعض فریاد کناں اعضائے رئیسہ کو مورفیا مل گیا اور ان سب پر بقول ٹھیکیدار پیسے بہت اٹھ گئے۔ ڈرائیور رکھ لیا گیا اور فرخندگی سے قبل دیکھ بھال کی اڑان شروع ہوئی دانستہ اہم مقامات سے گزاری گئی اور یہ پروپیگنڈہ شروع کیا گیا کہ ٹھیکیدار کا خیال اسے الگ کرنے کا ہے غرض وہ سارے اصول ملحوظ رکھے گئے جو ان امرا کے مدِ نظر ہوتے ہیں جو اپنی جوان العمر ناکتخدا لڑکیوں کو مشہور شہروں ہوٹلوں اور پہاڑوں پر لیے پھرتے ہیں اور اس خرچ کو بھی جہیز کا حصہ سمجھتے ہیں۔ موٹر کیا آئی یار لوگوں کو (JOY RIDE) کا موقع ہاتھ آیا افسران کو مفت Conveyance ملی اور غربا کی شادیوں کی رونق میں اضافہ ہوا۔

ٹھیکیدار جن کے کام ضلع کی تمام تحصیلات میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاموں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں کبھی کسی صحرائی علاقے میں جاتے وقت جہاں جانورانِ صحرائی خصوصاً پرندوں کے ملنے کا امکان ہو بر بنائے خلوص و محبت اپنے کسی شکاری دوست کو بھی ہمراہ لے جاتے ہیں۔ اب راستے بھر آپ سے موٹر کی تعریف کریں گے۔ ڈرائیور کو آہستہ چلانے کا حکم دیں گے اپنی پریشانیوں کا بڑی رقت سے ذکر کرتے ہوئے فرمائیں گے کہ موٹر کا بلا وجہ کا خرچ ہے روز مانگے میں رہتی ہے میرے اپنے کام بھی نہیں آتی فروخت کرنے کی فکر میں ہوں، بلا وجہ رقم پھنسی ہوئی ہے بس مناسب دام ملے اور فروخت کی اور یہ مصرع سننے والے کی زبان پر آ کر رہ جائے گا۔

"قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے"

اسی دوران میں کسی ویران ترین جگہ موٹر ایسی اَڑ کر کھڑی ہو جائے گی کہ ہلنے کا نام تک نہ لے گی۔ ڈرائیور تقریباً ایک گھنٹہ طفل تسلیاں دینے اور مختلف کمالات دکھانے کے بعد اعلان کر دے گا کہ جب تک فلاں پرزہ

دریافت نہ ہو موٹر آگے نہیں جا سکتی۔ ایسے ہی موقعہ پر کسی دانشمند نے کہا تھا کہ "اچھا تو پھر پیچھے لے چلو"۔ اب ہمراہی سردی میں اکڑ رہا ہوگا، بھوک سے آنتوں کا برا حال ہوگا، ٹھیکیدار دلجوئی کی انتہا کر دیں گے، ڈرائیور کو ڈانٹیں گے کہ روانگی سے قبل کیوں اچھی طرح دیکھ بھال نہ کی، موٹر کو خشمناک انداز سے گھوریں گے، اور پھر آپ کی طرف اس مترحم اور شرمیلی نظر سے دیکھیں گے گویا اپنی جوان اولاد کے کرتوتوں پر شرمندہ ہیں جس کی

وجہ سے دوستوں میں یوں رسوائی ہوئی۔ مجھے اس قسم کی سعادتیں اکثر نصیب ہوئی ہیں۔ اگر آپ حکامِ شہر میں سے ہیں تو آپ کا معمولی اشارۂ چشم ٹھیکیدار کے لئے حکم حاکم مرگ مفاجات کی حیثیت رکھتا ہے۔ وقت مقررہ سے کئی گھنٹے پیشتر موٹر معہ پٹرول آپ کے درِ دولت پر حاضر ہو جائے گی بات یہ ہے کہ ٹھیکیدار جانتے ہیں کہ اس عوامی دور میں افسران جو اب پبلک سرونٹ کہلاتے ہیں کس قدر با اختیار ہو چکے ہیں۔ امتیاز من و تو اٹھ چکا ہے اور پبلک والوں کی ذاتی باتوں میں افسران دخیل ہیں۔ اگر ٹھیکیدار سے آپ کے دوستانہ تعلقات ہیں تو آپ جب چاہیں موٹر لے سکتے ہیں بشرطیکہ وہ خالی ہو۔ خالی ہونا چنداں گراں بات نہیں ہے۔ لوگ مقبول پیشتر اپنے لئے ریزرو کرا لیتے ہیں اور ٹھیکیدار مروت کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے۔ دوست ہونے کی حیثیت سے آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ آپ پٹرول کو بھی گھر کی چیز سمجھیں۔ ٹرکس کے مالک ہونے کی وجہ سے ٹھیکیدار کا معقول رقم کا لین دین پٹرول پمپ سے رہتا ہے جس کی حساب فہمی کی ٹھیکیدار کو فرصت ذرا کم ہے۔ اور یہ بات ڈرائیور بخوبی سمجھتا ہے۔ چنانچہ موٹر مانگتے وقت آپ تھوڑا سا پٹرول ڈلوا لیں تاکہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔ ورنہ آپ کی ضرورت ڈرائیور معمولی نذرانہ لے کر پوری کر دے گا۔

اگر آپ سے دوستانہ مراسم نہیں ہیں محض شناسائی ہے تو بھی مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ان کے کسی دوست یا پڑوسی یا رشتے دار سے آپ کے تعلقات ضرور ہوں گے۔ آپ اس کے توسل سے اپنی ضرورت بیان کر سکتے ہیں اور یقین فرمایئے ٹھیکیدار کی مروت کبھی آپ کو اپنے

آستانۂ عالیہ سے بے نیل و مرام واپس آنے نہیں دے گی اور پھر ظاہر ہے کہ آپ محض انتہائی مجبوری کی وجہ سے گاڑی مانگ رہے ہیں تفریحاً نہیں فرض کیجئے آپ کے کچھ عزیز پاکستان جا رہے ہیں سب جانتے ہیں کہ آپ کے اسٹیشن پر میل اس قدر کم قیام کرتا ہے کہ عورتوں اور بچوں کا معہ اسباب سوار کرانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے اب معصوموں کے لئے اگر آپ بیس میل دور جنکشن تک کے لئے موٹر مانگیں تاکہ وہاں ان لوگوں کو میل میں آسانی سے جگہ مل جائے اور ٹھیکیدار حیلہ و حجت کریں، اور دوسرا شخص آپ کے ساتھ ہمدردی نہ کرے تو اس کی نامعقولیت میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ یہ تو ایک قسم کا عوامی مفاد کا کام ہے جس میں امداد کرنا ہر بھلے آدمی کا فرض ہے یا اگر آپ اس لئے موٹر مانگ رہے ہیں کہ اپنے سالے کے دوست کی بیوی کو معہ اس کی چچا زاد بہن کے جو اس کے یہاں مہمان ہے نمائش پہنچائیں تو کون کافر ہوگا جو آپ سے ہمدردی نہ کرے، اور آپ کے جذبے کی قدر نہ کرے جب اپنی موٹر موجود ہے تو آپ معزز خواتین کو کیوں تکلیف پہنچائیں، اور رکشہ والوں اور تانگہ والوں کو منہ مانگے دام دیں ظاہر ہے کہ اگر موٹر آپ اپنا نہ سمجھتے تو کیوں منہ خراب کرتے ویسے پچاس موٹریں موجود ہیں آپ تو محض جذبۂ اپنائیت کی بنا پر تشریف لائے ہیں۔ یا آپ کے دوست شکار کے لئے تشریف لائے ہیں اور ٹھیکیدار کی بدقسمتی سے ــــ آپ نے ان کی لاعلمی میں ان کی موٹر کی امید پر (جو گویا اپنی موٹر ہے) شکار کا پروگرام بنا لیا ہے اور ٹھیک اسی روز جب کہ آپ چار پانچ یوم کے واسطے شکار پر جا رہے ہیں ایک چپراسی اور افسر کو لے کر اپنے کام کا معائنہ کرانے چلے جائیں اور آپ کی سبکی ہو تو ظاہر ہے یہ ٹھیکیدار کی سخت بدتمیزی ہے کہ انہوں نے آپ کے مقابلے میں افسر کو ترجیح دی۔ دو چار یوم بعد تبدیل ہو جائے گا اور آپ لحد تک پہنچانے کا تہیہ کئے بیٹھے ہیں کیا تھا اگر اس افسر کو لے کر نہیں جاتے زیادہ سے زیادہ تین چار ہزار روپے کا نقصان ہو جاتا مگر صاحب کون سنتا ہے آدمی اپنی غرض میں اندھا ہوتا ہے خیر اس وقت تو آپ غصہ پی جایئے پھر دیکھئے ٹھیکیدار نے معافی نہ مانگی ہو تو سہی۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں اپنے لئے گاڑی پہلے سے ریزرو کرالیجئے تاکہ وقت پر شرمندگی نہ ہو اور یقین کیجئے اس شرمندگی میں ٹھیکیدار بابا بھی شریک ہوں گے۔ اگر موٹر گیراج میں نہ ہو تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، دراصل اس کا کوئی گیراج ہی نہیں۔

ایک کھپریل پوش سائبان سے اس کا کام لیا جاتا ہے۔ جہاں یہ کبھی کبھی ستانے یا جگالی کرنے کو کھڑی ہوجاتی ہے ورنہ ٹھیکیدار "اسپ گشتہ" کے اصول پر کارفرما ہیں اور ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے۔ جوش نے لکھا ہے۔

اور ہوگا کوئی جبر تو وہ بندۂ مجبور!
مردے کی طرح کلبۂ احزاں میں ملیگا

اسی طرح اگر آپ کو یہ موٹر جس کے لئے میں نے دانستہ لفظ "کار" استعمال نہیں کیا کہ اس کے دیہاتی خدوخال اس کے مقتضی نہیں، چلتی پھرتی یا سڑکوں پر دھکے کھاتی نظر نہ آئے تو یقیناً جبر مشیت سے مجبور کسی مستری کے ورکشاپ نما مکان کی زینت ہوگی۔

آخر میں اتنا اور عرض کردوں کہ گو یہ عوامی موٹر ہر طفل و جوان و پیر کی دلچسپی کا سبب بنی اور عروس و نوشاہ سے لے کر مریضوں اور مردوں تک کو سواری دی مگر عوام نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو وہ ہر محسن کے ساتھ کرتے آئے ہیں اور اب اس کی جراحتوں کا یہ عالم ہے کہ جملہ اعضائے رئیسہ جواب دے چکے ہیں، بینائی و گویائی رخصت ہونے کو ہیں چلتے چلتے روٹھ جانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگیا ہے۔ محض قوت ارادی کے بل بوتے پر رہٹ والے اونٹ کی رفتار سے چکر پورے کررہی ہے ٹھیکیدار ہر مناسب و نامناسب انسان سے اس کی لین دین کی گفتگو کر کے اس حد تک عاجز آگئے ہیں کہ ڈرائیور موقوف کردیا گیا ہے اور منافع کا تو سوال کیا لاگت کے نصف دینے کو تیار ہیں مگر کوئی راضی نہیں ہوتا۔ کباڑیوں کی "نگاہ گرگسی" اس پر پڑ چکی ہے اور وہ موقع کے انتظار میں ہیں کہ کب اس کے ٹکڑے نوالے کریں۔ وقت آخر ہے پھر بھی اگر آپ خود ڈرائیور ہوں یا ڈرائیور اور مستری کا انتظام کرلیں تو ٹھیکیدار سے امید ہے کہ آپ کو منع نہیں کریں گے۔ مگر جلدی نہ کیجئے پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔

مشتاق احمد یوسفی

چارپائی اور کلچر

غور کیجئے تو مناظرے اور مباحثے کے لئے چارپائی سے بہتر کوئی جگہ نہیں اس کی بناوٹ ہی ایسی ہے کہ فریقین آمنے سامنے ہی نہیں بلکہ عموماً اپنے حریف کی پیٹھ کا سہارا لے کر آرام سے بیٹھتے ہیں۔ اور بحث و تکرار کے لئے اس سے بہتر نشست ممکن نہیں، کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ فریقین کو ایک دوسرے کی صورت نظر نہ آئے تو کبھی آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ اسی بنا پر میرا عرصہ سے یہ خیال ہے کہ اگر بین الاقوامی مذاکرات گول میز پر نہ ہوئے ہوتے تو لاکھوں جانیں تلف ہونے سے بچ جاتیں۔ آپ نے خود دیکھا ہوگا کہ لدی پھندی چارپائیوں پر لوگ پیٹ بھر کے اپنوں کی غیبت کرتے ہیں، مگر دل برے نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ سبھی جانتے ہیں کہ غیبت اسی کی ہوتی ہے جسے اپنا سمجھتے ہیں۔ اور کچھ یوں بھی کہ ہمارے ہاں غیبت سے مقصود قطع محبت ہے نہ گزارش احوال واقعی بلکہ محفل میں

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

لوگ گھنٹوں چارپائی پر کسمساتے رہتے ہیں مگر کوئی اٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ اس لئے کہ ہر شخص بخوبی جانتا ہے کہ اگر وہ چلا گیا تو فوراً اس کی

غیبت شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ پچھلے پہر تک مرد ایک دوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے بحث کرتے ہیں اور عورتیں گال سے گال بھڑائے کچر کچر لڑتی رہتی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مرد پہلے بحث کرتے ہیں پھر لڑتے ہیں، عورتیں پہلے لڑتی ہیں اور بعد میں بحث کرتی ہیں۔ مجھے آخر الذکر طریقہ زیادہ معقول نظر آتا ہے اس لئے کہ اس میں آئندہ سمجھوتے اور میل ملاپ کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ ایک چارپائی پر بیک وقت کتنے آدمی بیٹھ سکتے ہیں، تو گزارش ہے کہ چارپائی کی موجودگی میں ہم نے کسی کو کھڑا نہیں دیکھا لیکن، اس نوع کے نظریاتی مسائل میں اعداد و شمار پر زور دینے سے بعض اوقات عجیب و غریب نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ جس وقت مسلمانوں نے اندلس فتح کیا تو وہاں کے بڑے گرجا میں چوٹی کے مسیحی علماء وفقہا کمال سنجیدگی سے اس مسئلہ پر بحث کر رہے تھے کہ سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے بیٹھ سکتے ہیں۔

ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ تنگ سے تنگ چارپائی پر بھی لوگ ایک دوسرے کی طرف پاؤں کئے "اِکی تشکل میں سوتے رہتے ہیں۔ چنچل ناری کا چیتے جیسا اجیت بدن ہو یا کسی عمر رسیدہ کی کمان ایسی کمر ــــــ یہ اپنے آپ کو ہر قالب کے مطابق ڈھال لیتی ہے۔ اور نہ صرف یہ کہ اس میں بڑی وسعت ہے بلکہ اتنی لچک بھی ہے کہ آپ جس آسن چاہیں بیٹھ اور لیٹ جائیں بڑی بات یہ ہے کہ بیٹھنے اور لیٹنے کی جو درمیانی صورتیں ہمارے ہاں صدیوں سے رائج ہیں ان کے لئے یہ خاص طور سے موزوں ہے یورپین فرنیچر سے مجھے کوئی چڑ نہیں لیکن اس کو کیا کیجئے کہ ایشیائی مزاج

نیم خیزی اور نیم درازی کے جن زاویوں اور آسائشوں کا عادی ہو چکا ہے۔ وہ اس میں میسر نہیں آتیں مثال کے طور پر صوفے پر ہم اکڑوں نہیں بیٹھ سکتے، کوچ پر دستر خوان نہیں بچھا سکتے، اسٹول پر قیلولہ نہیں کر سکتے، اور کرسی پر بقول اخلاق احمد اردو میں نہیں بیٹھ سکتے۔

عربی میں اونٹ کے اتنے نام ہیں کہ دور اندیش مولوی اپنے ہونہار

شاگردوں کو پاس ہونے کا یہ گر بتلاتے ہیں کہ اگر کسی مشکل اور کڈھب لفظ کے معنی معلوم نہ ہوں تو سمجھ لو کہ اس سے اونٹ مراد ہے اسی طرح اردو میں چارپائی کی جتنی قسمیں ہیں اس کی مثال اور کسی ترقی یافتہ زبان میں شاید ہی مل سکے:

کھاٹ۔ کھٹّہ۔ کھٹولہ۔ اڑن کھٹولہ۔ کھٹولی۔ کھٹ۔ چھپرکٹ۔ کھرا۔ کھرّی جھلنگا۔ پلنگ۔ پلنگڑی۔ ماچ۔ ماچا۔ ماچی۔ چارپائی۔ نواری۔ مسہری۔

یہ نامکمل سی فہرست صرف اردو کی وسعت ہی نہیں بلکہ چارپائی کی ہمہ گیری پر بھی دال ہے، اور ہمارے تمدن میں اس کا مقام و مرتبہ متعین کرتی ہے۔

لیکن چارپائی کی سب سے خطرناک قسم وہ ہے جس کے بچے کھچے اور ٹوٹے بانوں میں اللہ کے برگزیدہ بندے محض اپنی قوت ایمان کے زور سے اٹکے رہتے ہیں۔ اس قسم کے جھلنگے کو بچے بطور جھولا اور بڑے بوڑھے آلۂ تزکیۂ نفس کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اونچے گھرانوں میں اب ایسی چارپائیوں کو غریب رشتے داروں کی طرح کونوں کھدروں میں آڑے وقت کے لئے چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ خود مجھے مرزا عبدالودود بیگ کے ہاں ایک رات ایسی ہی چارپائی پر گزارنے کا اتفاق ہوا۔

جس پر لیٹتے ہی اچھا بھلا آدمی نون غنہ (ں) بن جاتا ہے۔

اس میں داخل ہو کر میں ابھی اپنے اعمال کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ یکایک اندھیرا ہو گیا جس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ ایک دوسرا ملازم اوپر ایک دری اور بچھا گیا۔ اس خوف سے کہ دوسری منزل پر اور کوئی سواری نہ آجائے میں نے سر سے دری پھینک کر اٹھنے کی کوشش کی تو گھٹنے بڑھ کے پیشانی کی بلائیں لینے لگے۔ کھڑبڑ سن کر مرزا خود آئے اور چیخ کر پوچھنے لگے کہ بھائی آپ ہیں کہاں؟ میں نے مختصراً اپنے محل وقوع سے آگاہ کیا تو انھوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے کھینچا۔ انھیں کافی زور لگانا پڑا، اس لئے کہ میرا سر اور پاؤں بانوں میں بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ اور بان سر سے زیادہ مضبوط ثابت ہوئے۔ بمشکل تمام انھوں نے مجھے کھڑا کیا۔

اور میرے ساتھ ہی بلکہ مجھ سے کچھ پہلے چارپائی بھی کھڑی ہو گئی۔
کہنے لگے! کیا بات ہے؟ آپ کچھ بے قرار سے ہیں۔ معدے کا فعل درست نہیں معلوم ہوتا۔
میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ دوڑ کر اپنا تیار کردہ چورن لے آئے، اور ہاتھ سے میرے منہ میں ڈالا۔ پھنکی منہ میں بھر کر شکریہ کے دو چار لفظ ہی کہنے پایا ہوں گا معاً نظر ان کے مظلوم منہ پر پڑ گئی جو حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ میں بہت نادم ہوا لیکن قبل اس کے کہ کچھ اور کہوں انہوں نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔ پھر مجھے آرام کرنے کی تلقین کر کے منہ دھونے چلے گئے۔
میں یہ چارپائی اوڑھے لیٹا تھا کہ ان کی منجھلی بچی آنکلی تتلا کر پوچھنے لگی
"چچا جان اکڑوں کیوں بیٹھے ہیں؟"
بعد ازاں سب بچے مل کر اندھا بھینسا کھیلنے لگے۔ بالآخر ان کی امی کو مداخلت کرنا پڑی
"کمبختو، اب تو چپ ہو جاؤ، کیا گھر کو بھی اسکول سمجھ رکھا ہے؟"
چند منٹ کسی شیرخوار کے دہاڑنے کی آواز آئی مگر جلد ہی یہ چیخیں مرزا کی لوریوں میں دب گئیں جن میں وہ ڈانٹ ڈانٹ کر نیند کو آنے کی دعوت دے رہے تھے چند لمحوں بعد مرزا اپنے نقش فریادی کو سینہ سے چمٹائے میرے پاس آئے اور انتہائی لجاجت آمیز لہجہ میں بولے۔
معاف کیجئے: آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ مگر منو میاں آپ کی چارپائی کے لئے ضد کر رہے تھے۔ انھیں دوسری چارپائی پر نیند نہیں آتی: آپ میری چارپائی پر سو جایئے۔ میں اپنی فولڈنگ چارپائی پر پڑ رہوں گا۔"
"میں نے بخوشی منو میاں کا حق منو میاں کو سونپ دیا اور جب اس میں جھولتے جھولتے ان کی آنکھ لگ گئی تو ان کے والد بزرگوار کی زبان تالوے لگی۔
اب سنیئے مجھ پر کیا گزری۔ مرزا خود تو فولڈنگ چارپائی پر چلے گئے مگر جس چارپائی پر مجھ کو بطور خاص منتقل کیا گیا۔ اس کا نقشہ یہ تھا کہ مجھے اپنے ہاتھ اور ٹانگیں احتیاط سے طے کر کے بالترتیب سینہ اور پیٹ پر

رکھنی پڑیں۔ اس شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے یوں دوچشمی ہو بنا
یونانی میزبان پر قراط کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے پاس دو چارپائیاں
تھیں ایک لمبی اور دوسری چھوٹی۔ ٹھنگنے مہمان کو وہ لمبی چارپائی پر سلاتا
اور کھینچ تان کر اس کا جسم چارپائی کے برابر کر دیتا۔ اس کے برعکس لمبے
آدمی کو وہ چھوٹی چارپائی دیتا اور جسم کے زائد حصوں کو کاٹ چھانٹ کر
ابدی نیند سلا دیتا۔

اس کے حدود اربعہ کے متعلق اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ انگڑائی
لینے کے لئے مجھے تین چار مرتبہ نیچے کودنا پڑا۔ کودنے کی ضرورت
یوں پیش آئی کہ اس کی اونچائی "درمیانہ" تھی۔ یہاں درمیانہ سے ہماری
مراد وہ پست بلندی یا موزوں سطح مرتفع ہے جس کو دیکھ کر یہ خیال
پیدا ہو کہ "نہ تو زمین کے لئے ہے نہ آسمان کے لئے"۔

گو کہ ظاہر بیں نگاہ کو یہ متوازی الاضلاع نظر آتی تھی مگر مرزا نے
مجھے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ بارش سے پیشتر یہ مستطیل تھی۔ البتہ بارش
میں بھیگنے کے سبب جو کان آ گئی تھی اس سے مجھے کوئی جسمانی تکلیف
نہیں ہوئی، اس لئے کہ مرزا نے از راہ تکلف ایک پائے کے نیچے ڈکشنری
اور دوسرے کے نیچے میرا اپنا جوتا رکھ کر درست کر دی تھی میرا خیال ہے
کہ تہذیب کے جس نازک دور میں غیور مرد چارپائی پر دم توڑنے کے بجائے
میدان جنگ میں دشمن کے ہاتھوں بے گور و کفن مرنا پسند کرتے تھے
اسی قسم کی مردم آزار چارپائیوں کا رواج ہو گا۔ لیکن اب جب کہ دشمن
سیانے اور چارپائیاں زیادہ آرام دہ ہو گئی ہیں، مرنے کے اور بھی معقول
اور باعزت طریقے دریافت ہو گئے ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق ہمارے ہاں ایک اوسط درجے
کے آدمی کی دو تہائی زندگی چارپائی پر گزرتی ہے۔ اور بقیہ اس کی آرزو
میں! بالخصوص عورتوں کی زندگی اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔ جو بساط محفل
بھی ہے اور مونس تنہائی بھی۔ اس کے سہارے وہ تمام مصائب انگیز کر لیتی
ہیں۔ خیر مصائب تو مرد بھی جیسے تیسے برداشت کر لیتے ہیں مگر عورتیں اس

لحاظ سے قابلِ ستائش ہیں کہ انھیں مصائب کے علاوہ مردوں کو بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

جس زمانے میں وزن کرنے کی مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی تو شائستہ خواتین چوڑیوں کے تنگ ہونے اور مرد چارپائی کے بان کے دباؤ سے دوسروں کے وزن کا تخمینہ کرتے تھے اس زمانے میں چارپائی صرف میزانِ جسم ہی نہیں بلکہ معیارِ اعمال بھی تھی۔ نتیجہ یہ کہ جنازے کو کندھا دینے والے چارپائی کے وزن کی بنا پر مرحوم کے جنتی یا اس کے برعکس ہونے کا اعلان کرتے تھے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ہمارے ہاں دبلے آدمی کی دنیا اور موٹے آدمی کی عقبیٰ عام طور سے خراب ہوتی ہے!

برصغیر میں چند علاقے ایسے بھی ہیں جہاں اگر چارپائی کو آسمان کی طرف پائنتی کر کے کھڑا کر دیا جائے تو ہمسائے تعزیت کو آنے لگتے ہیں سوگ کی یہ علامت بہت پرانی ہے گو کہ دیگر علاقوں میں یہ عمودی (۱) نہیں افقی (—) ہوتی ہے اب بھی گنجان محلّوں میں عورتیں اسی عام فہم استعارے کا سہارا لے کر کوستی سنائی دیں گی: الٰہی، تن تن کوڑھ ٹپکے مچیائی ہوئی کھاٹ نکلے! دوسرا بھرپور جملہ بددعا ہی نہیں بلکہ وقتِ ضرورت نہایت جامع و مانع سوانح عمری کا کام بھی دے سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں مرحوم کی عمر نامرادی وزن اور ڈیل ڈول کے متعلق نہایت بلیغ اشارے ملتے ہیں۔ نیز اس بات کی سند ملتی ہے کہ راہیِ ملکِ عدم نے وہی کم خرچ بالانشیں وسیلہ اختیار کیا جس کی جانب میر اشارہ کر چکے ہیں۔

تری گلی میں سدا اے کشندۂ عالم!
ہزاروں آتی ہوئی چارپائیاں دیکھیں

قدرت نے اپنی رحمت سے صفائی کا کچھ ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ ہر ایک چارپائی کو سال میں کم از کم دو مرتبہ کھولتے پانی سے دھارنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جو نفاست پسند حضرات جان لینے کا یہ طریقہ جائز نہیں سمجھتے وہ چارپائی کو الٹا کر کے چلچلاتی دھوپ میں ڈال دیتے ہیں پھر دن بھر گھر والے کھٹمل اور محلے والے عبرت پکڑتے ہیں۔ اہلِ نظر چارپائی کی چولوں میں رہنے والی مخلوق کی جسامت اور رنگت پر ہی سونے والوں کی صحت اور حسب و نسب کا قیاس

کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ یورپ میں گھوڑوں اور کتوں کے سوا کوئی کسی کا حسب و نسب نہیں پوچھتا۔

چارپائی سے جو پراسرار آوازیں نکلتی ہیں ان کا مرکز دریافت کرنا اتنا ہی دشوار ہے۔ جتنا کہ برسات کی اندھیری رات میں یہ کھوج لگانا کہ مینڈک کے ٹرانے کی آواز کدھر سے آئی یا یہ تشخیص کرنا کہ آدھی رات کو بلبلاتے ہوئے شیرخوار بچے کے درد کہاں اٹھ رہا ہے۔ چرچراتی ہوئی چارپائی کو میں نہ گل نغمہ سمجھتا ہوں، نہ پردۂ ساز اور نہ اپنی شکست کی آواز! درحقیقت یہ آواز چارپائی کا اعلان صحت ہے کیونکہ اس کے ٹوٹتے ہی یہ بند ہو جاتی ہے۔

عبداللہ حسین

ندی

آغاز:

ابھی ابھی بائرن کا خط آیا ہے اور مجھے ساری بات یاد آ گئی ہے دو برس پہلے کی بات، جو اب بھولتی جا رہی ہے۔ وقت کا ظلم اس طرح سے ہمارے ذہن کی تسخیر کرتا ہے اور اس طرح دل کی منزل کا پتا گم ہوتا ہے کہ ڈھونڈے نہیں ملتا۔ یہ منزلوں کا گروہ ہے جو فراموشی کی طرف رواں ہے اور یہ ہماری یاد کی رحمدلی ہے کہ منزل منزل پر ہمارا ساتھ چھوڑتی رہتی ہے سارے وقتوں کی یاد کرے کہ ہم نہ چل سکتے ہیں نہ مستقبل کے اندھیروں میں شریک ہو سکتے ہیں۔

یہ خزاں کی بڑی پرامن اور شفاف سہ پہر ہے اور میں اپنے گھر کے سامنے ندی پر بیٹھا ہوں۔ گھر کے برآمدے میں مجھے وہ میز نظر آ رہی ہے جس پر صبح کی ڈاک سے آئے ہوئے تمام خط کھلے پڑے ہیں۔ سوائے اس ایک خط کے جو میں نے جیب میں رکھ لیا ہے اور بار بار سینہ پر ہاتھ پھیر کر قمیض کے اندر نفیس کاغذ کی کھڑکھڑاہٹ کو محسوس کر رہا ہوں اور اسے دوبارہ پڑھنا چاہتا ہوں مگر نہیں پڑھ سکتا۔ کیونکہ خزاں کی زرد دھوپ میں بڑا امن ہے اور پانی کے بہنے میں اور دور دور تک ندی میں خشک پتے گرائے ہوئے زرد درختوں میں اور درختوں کے بیچ تھمی ہوئی ہوا میں، ہل چلاتے ہوئے کسانوں میں ایک ایسا پرسکوت پرامن سحر ہے جو صرف خزاں کے موسم میں ہوتا ہے اور سہ پہر کے وقت ہی ہوتا ہے اور جس میں کسی بدامنی کسی خلل اندازی کی ذرہ بھر گنجائش نہیں ہے۔ وہ کون تھا جس نے کہا تھا کہ دنیا کا سب سے رقت انگیز سب سے دلگداز منظر کسان کے زمین

میں ہل چلانے کا سہ غانا کوئی سور تھا میں ایک بار پھر سینہ کی جیب میں محسوس کرتا ہوں میرے عین نیچے پانی میں دور دراز کے سفر گمشدہ محبوب چہرے بہتے ہوئے گزر رہے ہیں وقت [illegible] سا ابھار رہا ہے۔ ندی میری عزیز دوست اب میں تم سے مخاطب ہوں۔

نتیجے

• اس شہر کا ایک کیریکٹر ہے اپنی جگہ پر الگ اور انوکھا اور برگزیدہ اور پرکشش سا جیسے پیرس اور ویانا کا کیریکٹر ہے ان جگہوں کے نام آتے ہی ذہن میں داستانیں جاگ پڑتی ہیں نیویارک [illegible] یہ چند سو میل کے فاصلے پر ہے لیکن وہاں جانے کا خیال کبھی میرے دل میں نہیں آیا • ساری اچھائی اور ساری نوجوانی اور [illegible] خوبصورت کہانیوں کی طرح ہمارے خوابوں میں اور گمشدہ محبوب چہروں میں [illegible] میں اور گزرے ہوئے وقت میں [illegible] جاتی ہے اور کبھی بھار بہتے ہوئے پانی میں [illegible] دیکھتے رہنے پر کبھی کہیں سے ابھر آتی ہے۔ ڈوب جاتی ہے • انسانوں سے اپنے آپ کو وابستہ مت کرو سلطان حسین ورنہ انہیں بھول بھلیوں میں رہ جاؤ گے آزادی اصل چیز ہے • وہ خوبصورت حسین جنگل اور وہ پہلی دوپہر [illegible] آہستہ جاگتا ہوا مضبوط ہوتا ہوا احساسِ رفاقت میری زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اختتام

اب ندی کے پل پر شام پڑ رہی ہے اور بہت سارا وقت منظر کے پانی میں بہتا ہوا گزر گیا ہے اب کسان یہاں سے جا چکا ہے۔ اور درختوں میں رکی ہوئی ہوا چلنے لگی ہے اور یاد کرتے ہوئے دل کا خوف اترتا جا رہا ہے میں خط کو جیب سے نکالتا ہوں۔ اور دن کے آخری اجالے میں اسے آنکھوں کے قریب لاتا ہوں . . . .

R I O S Publications Series (16)

NASR KA HUSN

MERE AHD KE SAHIB-I TARZ NASR-NIGAR

Compiled by

ABIDRAZA BEDAR

RAMPUR INSTITUTE OF ORIENTAL STUDIES

1806 - Kalan Mahal, Delhi - 6

1968